کاغذی پیرہن
محی الدین نواب
حمیدی

کاغذی پیرہن

محی الدین نواب

الرفاعی پبلشرز اینڈ بک سیلرز
چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ، لاہور۔

کاغذی پیرہن

ایک ایسے خاندان کی کہانی جو بظاہر رشتے ناتوں
کی مضبوط زنجیر میں بندھا ہوا تھا مگر کسی کو معلوم نہ تھا
کہ اس زنجیر میں کہیں کسی راز کی کمزور کڑی تھی
تو کہیں تقدیر کا کچا جوڑ۔
معمولی آغاز سے سنگین انجام تک سفر کرنے
والے کرداروں کی عبرتناک داستان

بار اول ـــــ ۲۰۰۱ء
مطبع ـــــ یُو اینڈ می پرنٹرز لاہور
قیمت ـــــ -/۱۵۰ روپے

حمیدی

ISBN 969-517-045-5

اشاعت :
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار
لاہور۔ فون: ۲۱۴۔۲۴۔

آپ فرمائیں گے۔'' کاغذ کی ناؤ ڈوب جاتی ہے۔'' شاید ڈوب جاتی ہو۔ آپ دعویٰ کریں گے۔'' خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔'' شاید خوشبو نہ آتی ہو لیکن آپ کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ کھلونا رائفل سے گولی چل سکتی ہے، آدمی مر سکتا ہے اور بے شک و شبہ مر سکتا ہے۔

نیلما نے خوش ہو کر اس منی رائفل کو بڑے پیار سے سہلایا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پرانے ریوالور کو دور پھینک دیا۔ پھر کہا۔'' دادا جان! آج میں اس رائفل سے شوٹ کروں گی۔ آپ جلدی مر جائیں گے، نا؟''

بوڑھے دادا نے اسے محبت اور شفقت سے دیکھا جیسے دل کی گہرائیوں سے جھانک کر دیکھ رہا ہو۔ پھر اپنی پوتی کے پھول جیسے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔'' دادا کی جان! یہ رائفل کیا چیز ہے، جس دن تمہاری ذہنی حالت درست ہو گی، میں خوشی کے مارے سچ مچ مر جاؤں گا۔''

وہ دیکھنے میں اٹھارہ برس کی بہت ہی خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی لیکن ذہنی طور پر نادان بچی تھی۔ کتنے ہی قابل، تجربہ کار اور مہنگے ڈاکٹروں سے علاج کرایا گیا۔ ان کی متفقہ رائے تھی کہ اس کے خون میں افیون کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب تھا، آج بھی اس جوان بچی کو کھانے یا پینے کی کسی چیز میں افیون دی جاتی تھی جس کے نتیجے میں وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

دادا نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔'' جب تک میری سانس ہے، میں تمہیں معصوم بچی کی طرح ان کھلونوں سے کھلاتا رہوں گا۔ میں ادھر جا کر کھڑا ہو جاؤں گا، تم یہاں سے گولی چلاؤ۔''

وہ خوشی سے تالی بجا کر بولی۔'' کیا نئی رائفل چلانے سے خون نکلے گا؟''

''میری بچی، یہ رائفل ایک کھلونا ہے۔ سچ مچ کی بندوق سے خون نکلتا ہے پھر آدمی سچ مچ مر جاتا ہے۔ جب تم گولی چلاؤ گی تو میں جھوٹ موٹ سینہ تھام کر زمین پر گر جاؤں گا۔''

وہ پاؤں پٹخ کر رونے کے انداز میں بولی۔ ''آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ خون ضرور نکلے گا۔ نہیں نکلے گا تو میں رونے لگوں گی۔''

''روئیں تمہارے دشمن۔ میں اپنی بیٹی کو رونے نہیں دوں گا۔''

دادا نے آس پاس دیکھا۔ وہ اپنے باغیچے میں تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''تم ٹھہرو میں لال رنگ لے کر آتا ہوں۔ جیسے ہی تم گولی مارو گی میں رنگ لگا کر گر پڑوں گا۔''

''نہیں، انکل کہتے تھے، اس رائفل سے خون نکلتا ہے۔ آدمی تھوڑی دیر مرنے کے بعد زندہ ہو جاتا ہے۔''

انہوں نے محبت سے سوچتے ہوئے دیکھا، پھر کہا۔ ''اچھا بیٹی، تم جیتیں ہم ہارے۔ گولی چلاؤ۔''

وہ پوتی کے پاس سے اُٹھ کر ایک جھاڑی کے پاس آئے، وہاں سے ایک کانٹا توڑ لیا۔ ارادہ تھا جب وہ لاڈلی گولی چلائے گی تو وہ چیخ مار کر اپنے جسم کے کسی حصے کو زخمی کریں گے پھر زمین پر گر پڑیں گے۔ پوتی جب خون بہتا دیکھے گی تو خوشی سے تالیاں بجانے لگے گی۔ وہ اس کے سامنے ایک درخت کے سائے میں کھڑے ہو گئے، پھر کہا۔ ''میری بیٹی بہت اچھا نشانہ لگاتی ہے، چلو میں تیار ہوں۔''

نیلما نے رائفل اُٹھائی۔ پھر نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ چور ہیں، میں پولیس۔ اے مسٹر چور، سیدھی طرح کھڑے رہو، ورنہ گولی نہیں لگے گی۔''

وہ ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ رائفل کی مکھی سے لگا کر دادا جان کو نشانے پر رکھنے لگی۔ اس رائفل میں ٹیلی اسکوپ یعنی دوربین لگی ہوئی نہیں تھی لیکن کوئی دوربین سے دیکھ رہا تھا۔ اس دوربین کے لینس میں ٹارگٹ کا کراس پوائنٹ بنا ہوا تھا اور وہ کراس پوائنٹ بوڑھے کی ٹھیک پیشانی پر تھا۔ نیلما نے ٹھائیں کی آواز منہ سے نکالتے ہوئے ٹرائیگر کو دبایا۔ اسی لمحے گولی چلنے کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ بوڑھے دادا کی پیشانی میں سوراخ ہوا اور خون اُبل پڑا۔ چہرے پر ایک ساعت کے لئے کرب کے آثار پیدا ہوئے۔

دیدے پھیلے، اس کے بعد وہ بوڑھا جسم دھپ سے گھاس پر گر پڑا۔

گولی چلنے کی آواز گونج رہی تھی۔ درختوں سے پرندے شور مچاتے ہوئے اڑتے جا رہے تھے۔ نیلما خوش ہو کر تالی بجاتی ہوئی پاس آ رہی تھی۔ ''واہ دادا جان مر گئے۔ خون بھی نکل گیا۔ کتنا مزہ آ رہا ہے۔''

کوٹھی کے دوسرے افراد اور ملازموں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی، وہ دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ نیلما نے ان کی طرف رائفل کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''خبردار! جہاں ہو، رک جاؤ، میں نے چور کو گولی ماردی ہے۔''

آنے والے حیرانی اور پریشانی سے بوڑھے کی لاش کو دیکھ رہے تھے، لاش کے پاس ہی سیون ایم ایم کی رائفل پڑی ہوئی تھی۔ ساکت جسم، پھیلے ہوئے دیدے اور پیشانی سے رستا ہوا لہو ان آنے والوں کو سمجھا رہا تھا کہ دادا پوتی سے دور رہنا چاہئے۔ یہ مرڈر کیس ہے۔

ایک ادھیڑ عمر کی خوش پوش عورت نے لاش کو دیکھتے ہی رونا شروع کر دیا۔ ''اوہ ڈیڈ، مجھے یقین نہیں آتا، آپ زندہ ہیں۔ نیلما بہت معصوم ہے، آپ سے محبت کرتی ہے، یہ آپ کو گولی نہیں مار سکتی۔ ڈیڈ، بولئے ڈیڈ، یہ محض کھیل ہے۔''

نیلما نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''پھوپھی اماں، آپ تو رونے لگیں، یہ سچ مچ نہیں مرے ہیں۔ ابھی زندہ ہو جائیں گے۔''

پھر وہ دادا سے بولی۔ ''اے چور، یہ پولیس حکم دیتا ہے، اب اٹھ جاؤ۔'' اس نے منی رائفل کی نال کو دادا کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اٹھو ورنہ پھر گولی ماروں گی۔''

تب اس کی نظر قریب پڑی ہوئی رائفل پر گئی۔ اس نے خوش ہو کر منی رائفل پھینک دی۔ دوڑ کر سیون ایم ایم کی رائفل اٹھا لی۔ پھوپھی نے سہم کر کہا۔ ''اری یہ کیا کرتی ہے باؤلی؟ اسے پھینک دے ورنہ گولی چل جائے گی۔''

پھوپھی یہ کہتے ہی دور بھاگنے لگی، دوسرے بھی ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ رہے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''سب بزدل ہیں۔ سب ڈرپوک ہیں۔ نیلما پولیس سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں۔ رک جاؤ، نہیں تو یہ پولیس سب کو گولی مار دے گی۔''

پھوپھی بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے

لگیں۔ وہ سہمی ہوئی دروازے کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھیں، کہیں نیلما نہ آ جائے۔ رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''ہیلو انسپکٹر، میں غازی جمال الدین کی کوٹھی سے بول رہی ہوں۔ میرے والد غازی جمال الدین کا قتل ہو گیا ہے۔ آپ فوراً آئیے، ہماری بھی جان خطرے میں ہے۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''آپ ریسیور رکھ دیں۔ پھر میں اس رپورٹ کی تصدیق کروں گا۔''

''تصدیق کرنے تک ہمارا بھی قتل ہو جائے گا۔''

''تھانہ دس منٹ کے فاصلے پر ہے۔ میں فوراً پہنچوں گا، فی الحال آپ ریسیور رکھ کر وہیں کھڑی رہیں۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''کیا یہ غازی جمال الدین کی کوٹھی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا یہاں کسی کا قتل ہوا ہے؟''

''میرے والد کا قتل ہوا ہے۔ میں ان کی بیٹی عاصمہ بول رہی ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

''میں انسپکٹر اکرم تصدیق کر رہا ہوں۔ کیا قاتل موجود ہے؟''

''موجود ہے۔ کیا آپ فون پر ہی ساری تفتیش کر لینا چاہتے ہیں؟''

''ہمیں غلط فون بھی موصول ہوتے ہیں، اس لئے میں اتنے سوالات کر رہا ہوں۔ بہرحال، ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ عاصمہ ریسیور رکھ کر محتاط انداز میں چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی۔ پردہ ہٹا کر باغیچے میں دیکھا۔ درخت کے سائے میں اس کے والد کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ کھلونا رائفل گھاس پر تھی اور خطرناک رائفل نیلما کے ہاتھوں میں نظر آ رہی تھی۔ اگر کوئی قاتل معصوم ہو سکتا ہے تو نیلما اس کی بہترین مثال تھی۔

وہ دادا کے پاس بیٹھ کر کہہ رہی تھی۔ ''میں اتنی دیر سے کہہ رہی ہوں۔ آپ اٹھتے کیوں نہیں؟ بس بھی کریں، جلدی سے زندہ ہو جائیں نہیں تو میں نہیں کھیلوں گی۔''

خون پیشانی سے بہتا ہوا چہرے اور گریبان کو تر کر رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کو لہو میں بھگو

کر اچھی طرح دیکھتے ہوئے بولی۔ ''سچ مچ لہو بہہ رہا ہے، دادا جان! آپ نے تو کمال کر دیا........ اُٹھیے نا، پھر سے کھیلیں گے۔'' اس نے انتظار کیا، پھر رونے لگی۔ دادا جان اس کی ہر بات مانتے تھے، آج نہیں مان رہے تھے۔ اُس نے روتے روتے اپنا سر بوڑھے سینے پر رکھ دیا۔ کچھ دیر تک بچوں کی طرح اُوں اُوں کی آواز نکلتی رہی۔ پھر رونا بند کر دیا۔ چپ ہو کر دل کی دھڑکنوں کو سننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ کبھی کبھی لاڈ میں آ کر ان کے سینے پر سر رکھ دیا کرتی تھی، ان سے باتیں کرنے کے دوران دل کی دھڑکنوں کو سنا کرتی تھی۔ آج کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سینے کی بوڑھی قبر میں موت کا سناٹا تھا۔

اس نے تصوروں میں دادا جان کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''بیٹی! میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے۔ جو بات تمہیں بتائی جائے، اسے یاد رکھنے کی کوشش کرو۔''

''دادا جان! میں بھول جاتی ہوں۔''

''کم از کم خاص باتیں یاد رکھا کرو۔ میں نے کہا تھا، گھڑی کی ٹک ٹک اور انسان کے دل کی دھک دھک جب تک سنائی دیتی ہے تب تک دونوں زندہ رہتے ہیں۔ ٹک ٹک رک جائے تو گھڑی بند ہو جاتی ہے۔ دھک دھک رک جائے تو آدمی مر جاتا ہے پھر کبھی زندہ نہیں ہوتا۔''

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ دادا جان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں آپ نہیں مر سکتے، آپ پھر زندہ ہو جائیں گے۔ پلیز دادا جان، اپنے دل کی دھڑکن سنائیے۔ پھر سے زندہ ہو جائیے۔''

وہ بول رہی تھی اور آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ اس کے اندر یقین پیدا ہو رہا تھا کہ دادا جان دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے۔ انہوں نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا۔ آدمی گھڑی کی طرح بولنا بند کر دے تو ہمیشہ کے لئے اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ وہ مر جاتا ہے اور اپنے رونے والوں کے آنسوؤں سے بھی زندہ نہیں ہو پاتا۔

ایک انسپکٹر اور چھ مسلح سپاہی آ گئے۔ کوٹھی کے تمام افراد اور ملازم چھپے ہوئے تھے۔ پولیس کو دیکھتے ہی نکل آئے۔ پھوپھی نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ وہاں ہے۔''

انسپکٹر نے اُدھر دیکھا۔ ایک نوخیز دوشیزہ لاش کے پاس دکھائی دے رہی تھی۔ اس

نے پوچھا۔ ''قاتل کہاں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''انسپکٹر، اسی لڑکی نے قتل کیا ہے لیکن وہ معصوم ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ اس نے کتنی بھیانک واردات کی ہے۔''

نیلما اپنے دادا جان کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ انسپکٹر نے دور ہی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ہاتھ میں رائفل نظر آ رہی ہے۔''

''ہاں، ہم اسی ڈر سے کوٹھی میں چھپ گئے تھے۔ وہ رائفل کے استعمال کو نہیں سمجھتی ہے۔ انجانے پن میں ہم پر بھی گولی چلا سکتی تھی۔''

انسپکٹر کے حکم پر سپاہیوں نے نیلما کو دور ہی سے گھیرنے کے لئے دبے قدموں چلنا شروع کیا۔ وہ درختوں کی آڑ لیتے جا رہے تھے۔ پھر انسپکٹر نے للکار کر کہا۔ ''لڑکی! رائفل پھینک دو، ورنہ میں گولی مار دوں گا۔''

نیلما نے چونک کر دیکھا۔ انسپکٹر کے پاس اپنی پھوپھی کو دیکھ کر یکبارگی اچھل کر کھڑی ہوگئی مگر رائفل ہاتھ میں تھی۔ وہ بھلا کسی کی دھمکی کو کیا سمجھتی۔ انسپکٹر کی دھمکی بیکار گئی۔ اس نے پھوپھی کو دیکھتے ہی دونوں بانہیں پھیلا کر روتے ہوئے کہا۔ ''ہائے پھوپھی جان، دادا جان تو مر گئے، یہ تو بولتے نہیں ہیں۔''

وہ روتی ہوئی، دوڑتی ہوئی، دونوں بانہیں پھیلا کر پھوپھی کی طرف آنے لگی۔ پھوپھی نے ہاتھ میں صرف رائفل کو دیکھا پھر وہاں سے چیختے ہوئے بھاگنے لگیں۔ انسپکٹر دوڑتا ہوا اپنی جیپ کے پیچھے چلا گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ''لڑکی، رائفل پھینک دو۔''

نیلما نے جب پھوپھی کو بھاگتے دیکھا تو ان کی بیٹی نادرہ کی طرف پلٹ گئی۔ دونوں بانہیں پھیلا کر بولی۔ ''باجی! میرے دادا جان بولتے نہیں ہیں، ذرا دیکھنا کیا سچ مچ مر گئے ہیں؟''

نادرہ نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ بھی چیختے ہوئے بھاگنے لگی۔ نیلما حیران تھی، دادا جان کے مرتے ہی ساری دنیا اس سے منہ پھیر رہی تھی۔ اپنے سگے دور بھاگ رہے تھے۔ اچانک اس کا ماموں زاد بھائی زبیر سامنے آ گیا۔ اس نے نیلما کے بازو کو تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''اس دنیا میں پیدا ہوئی ہو تو یہاں کی مکاریوں کو سمجھو۔ رائفل مجھے دو۔''

اس نے فوراً ہی رائفل چھین لی۔ اسے اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے انسپکٹر کو آواز دی۔ ''انسپکٹر صاحب! رائفل میرے ہاتھ میں ہے۔ خطرہ مجھ سے ہونا چاہئے لیکن میں ہوش مند ہوں۔ یہ معصوم لڑکی کبھی اپنے ہوش میں نہیں رہی۔ اس سے آپ ڈر رہے ہیں۔ کیا میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر میدان چھوڑ جائیں گے۔ تھانے جا کر پناہ لیں گے۔''

انسپکٹر نے جیپ کے پیچھے سے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا بکواس ہے، رائفل پھینک دو۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔''

اس نے رائفل پھینک دی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھالئے پھر کہا۔ ''نیلما تم بھی ہاتھ اٹھا لو، یہ بے چارے ڈر رہے ہیں۔''

اس نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''زبیر! میرے دادا جان بولتے نہیں ہیں۔''

زبیر نے فوراً ہی ہاتھ نیچے کر دیئے۔ رومال نکال کر اس کی آنکھیں پونچھنے لگا۔ مسلح سپاہیوں نے دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ انسپکٹر نے اپنے رومال سے نیچے گری ہوئی رائفل کو اٹھا لیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''کوئی لاش کے قریب نہ جائے۔ ان دونوں کو کوٹھی میں لے چلو۔''

وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ پھوپھی نے آگے بڑھ کر نیلما کو سینے سے لگا لیا۔ پھر روتے ہوئے بولیں۔ ''ہائے میری بچی، تُو نے یہ کیا کیا؟ تجھے وہ رائفل کس نے دی تھی؟ تُو نے میرے ڈیڈی کو مار ڈالا، اپنے دادا جان کو مار ڈالا۔ ہمارے سروں سے ہمارے بزرگ کا سایہ اٹھا دیا۔ ہائے، اب میں کسے ڈیڈی کہوں گی۔''

زبیر نے کہا۔ ''آنٹی! آپ اس انداز میں ماتم نہ کریں کہ نیلما قاتل کہلائے۔ اس نے دادا جان کو قتل نہیں کیا ہے۔''

عاصمہ پھوپھی نے زبیر کو گھور کر دیکھا۔ پھر آنکھوں پر آنچل رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہائے میں یتیم ہوگئی، اس احمق لڑکی نے بھرے گھر کو اجاڑ دیا۔ میں کب کہتی ہوں، اس نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے۔ یہ تو معصوم ہے، اس نے انجانے میں گولی چلائی ہوگی۔ ہائے، میں یتیم ہوگئی۔''

''اس نے گولی بھی نہیں چلائی ہے۔''

انسپکٹر نے زبیر سے کہا۔ ''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے رائفل اس لڑکی کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ یہ آلۂ قتل کے ساتھ لاش کے پاس موجود تھی۔''

زبیر نے کہا۔ ''اس کے ہاتھ میں کھلونا رائفل تھی۔''

انسپکٹر نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس قاتلہ کے ہاتھ میں یہ رائفل تھی۔ اس کی انگلیوں کے نشانات اسی پر ہیں۔''

''آپ اس کھلونا رائفل کو بھی فنگر پرنٹ سیکشن میں بھیجئے۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوجائے گا۔''

ایک سپاہی نے انسپکٹر سے کہا۔ ''جناب! اس جوان نے اپنے رومال سے آلۂ قتل کو صاف کیا تھا۔ میں ادھر درخت کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔''

انسپکٹر غرا کر زبیر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آئی سی، تم نے ایک اہم ثبوت مٹا دیا ہے۔''

''جس طرح آپ نے اسے رومال سے پکڑا ہے، اسی طرح میں نے بھی پکڑا تھا۔ اگر نشانات مٹ گئے ہوں تو الزام ہم دونوں پر آئے گا کیونکہ ہم دونوں نے اپنا اپنا رومال استعمال کیا ہے۔''

''کیا تم مجھے قانون سکھا رہے ہو؟''

''میں نیلما کے تحفظ کی بات کر رہا ہوں۔ آپ تمام توجہ نیلما پر مرکوز نہ کریں۔ ایسے قاتل کو اہمیت دیں جس نے سیون ایم ایم کی رائفل سے دادا جان کو ہلاک کیا۔ پھر یہ رائفل لاش کے پاس پھینک کر فرار ہوگیا۔''

''تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے تم نے ہی ایسا کیا ہے؟''

''جو پولیس سے تعاون کرتا ہے، وہی مجرم سمجھ کر دھر لیا جاتا ہے لوگ اسی لئے تعاون سے گریز کرتے ہیں۔''

انسپکٹر نے عاصمہ سے پوچھا۔ ''یہاں کتنے افراد نے اس لڑکی کو گولی چلاتے دیکھا ہے؟''

عاصمہ اور اس کی بیٹی نادرہ نے کہا۔ ''ہم نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔'' ملازموں نے بھی یہی بیان دیا۔ کسی نے نیلما کو گولی چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھی تھی جو بعد میں زبیر نے چھین لی۔ پھر انسپکٹر کے حکم پر اسے پھینک دیا۔ ان سب

سے تحریری بیانات پر دستخط لئے جا رہے تھے۔ اس دوران فنگر پرنٹس کے ماہر اور محکمے کے فوٹو گرافرز آ گئے تھے اور اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

زبیر نے فون پر وکیل کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے نیلما کی ضمانت کے انتظامات کے لئے کہہ دیا تھا۔ انسپکٹر کے ہاتھ ایک اہم کیس آیا تھا۔ وہ اس کیس کا ہر پہلو سے جائزہ لئے جا رہا تھا۔ ایک ایک فرد سے تفصیلی بیانات لے رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں خاندان کے جو تفصیلی حالات معلوم ہوئے، وہ کچھ یوں تھے۔

غازی جمال الدین ایک کروڑ پتی بزنس مین تھا۔ ان کے ایک بیٹے کا نام غازی کمال الدین اور ایک بیٹی کا نام عاصمہ تھا۔ عاصمہ کا شوہر علاؤ الدین چنگیزی ایک ناکام بزنس مین تھا۔ شادی کے بعد گھر داماد کی حیثیت سے رہنے لگا تھا۔ چنگیزی سے دو اولادیں تھیں۔ عاصمہ کے ایک بیٹے کا نام ارباب چنگیزی اور بیٹی کا نام نادرہ تھا۔

عاصمہ اپنے بیٹے ارباب کی نسبت اپنے بھائی کی بیٹی نیلما سے طے کرنا چاہتی تھی مگر بھائی اپنی بیٹی کو اپنے سالے کے بیٹے زبیر سے منسوب کرنا چاہتا تھا۔ مختصر یہ کہ نیلما کے دادا جان نے اپنی پوتی کو صرف زبیر سے منسوب ہی نہیں کیا بلکہ نیلما کی پہلی سالگرہ پر زبیر سے نکاح بھی پڑھوا دیا۔

عاصمہ کہتی تھی بچپن کی شادی جائز نہیں ہے۔ جب وہ جوان ہوئے تو بچپن کے نکاح نامے پر دوبارہ دلہا دلہن کے دستخط لے لئے۔ پھر فیصلہ سنایا۔ نیلما ذہنی مریضہ ہے، اس کا علاج جاری ہے، جب یہ ذرا ہوشمند ہوگی تو اسے دلہن بنا کر رخصت کر دیا جائے گا۔

اب عاصمہ کہتی تھی جو لڑکی ہوشمند نہ ہو، اس کا نکاح جائز نہیں ہوتا۔ اس کا یہ اعتراض ایک عرصے سے جاری تھا۔ زبیر اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ خاندان سے باہر کا لڑکا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو اسے کوٹھی میں آنے سے روک دیتی لیکن اس سے داماد کا رشتہ ہوگیا تھا۔ وہ اسے روک نہیں سکتی تھی لیکن نیلما کو دور رکھتی تھی اور جواز یہ پیش کرتی تھی کہ رخصتی سے پہلے میاں بیوی کے درمیان فاصلہ ہونا چاہئے۔

عاصمہ نے اپنے باپ غازی جمال الدین کے قتل پر بیان دیا۔ ''میرے ڈیڈی، نیلما کا رشتہ زبیر سے کر کے پچھتا رہے تھے۔''

انسپکٹر نے پوچھا۔ ''کیوں پچھتا رہے تھے؟''

"زبیر ایک عرصے سے بیروزگار ہے۔ میرے ڈیڈی کا کاروبار سنبھالنے کا اہل نہیں ہے۔ یہ جاسوسی ناولیں پڑھتا ہے۔ اس پر جاسوس بننے کا خبط سوار رہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے باقاعدہ ٹریننگ حاصل کی لیکن امتحان میں ناکام رہا۔ میرے ڈیڈی، نیلما سے نکاح منسوخ کرنا چاہتے تھے۔ اس نے سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ڈیڈی کو قتل کر دیا۔ میں یقین سے کہتی ہوں، یہی قاتل ہے۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "آپ کے صاحبزادے ارباب اور شوہر چنگیزی صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ کل صبح کی فلائٹ سے لاہور گئے ہیں، آج شام تک واپسی کی توقع ہے۔ میری بیٹی نادرہ نے ابھی فون پر اس واردات کی اطلاع نہیں دی ہے۔"

نادرہ نے بیان دیا۔ "میں نے نیلما کو گولی چلاتے نہیں دیکھا لیکن رائفل اسی کے ہاتھ میں تھی۔ میں دور ہی دور سے دیکھتی رہی لہٰذا یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس کے ہاتھ میں اصلی رائفل تھی یا کھلونا رائفل۔"

"تم قتل کے وقت کہاں تھیں؟"

"میں اپنے بیڈروم میں امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ گولی کی آواز سن کر کھڑکی سے دیکھا۔ باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ آپ کے آنے پر باہر آئی ہوں۔"

انسپکٹر نے زبیر سے پوچھا۔ "تم قتل کے وقت کہاں تھے؟"

زبیر نے مسکرا کر عاصمہ آنٹی کو دیکھا، پھر کہا۔ "یہ مجھے قاتل کہہ رہی ہیں جبکہ گولی چلتے وقت میں ان کی بیٹی نادرہ کی خواب گاہ میں تھا۔"

عاصمہ نے چونک کر بیٹی کو دیکھا، انسپکٹر نے پوچھا۔ "مس نادرہ، کیا یہ سچ ہے؟"

نادرہ اپنی ماں کے سامنے جھجک رہی تھی، نظریں چرا رہی تھی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "میری طرف دیکھو اور سچ بولو۔ کیا گولی چلتے وقت مسٹر زبیر تمہارے کمرے میں تھے؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "جی ہاں۔"

عاصمہ نے غصے سے کہا۔ "جھوٹ بولتی ہے۔ اری کیا میری ناک کٹوانا چاہتی ہے۔ یہ تیری خواب گاہ میں کیوں آئے گا؟"

زبیر نے کہا۔ "بیٹی سے ایسا سوال نہیں پوچھتے۔"

"یوشٹ اپ۔"

نادرہ نے کہا۔ "ممی! لاسٹ ایئر کا پرچا بہت مشکل تھا۔ میں زبیر سے حل کرا رہی تھی۔"

عاصمہ اور انسپکٹر مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔ نادرہ کے جھجکنے، شرمانے اور ہچکچا کر باتیں کرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "آپ لوگ ذاتی اور گھریلو معاملات میں نہ الجھیں۔ کیوں مسٹر زبیر: کیا واقعی آپ انٹیلی جنس بیورو کے ٹریننگ سینٹر میں رہ چکے ہیں؟"

"جی ہاں، مجھے افسوس ہے کہ امتحان میں ناکام رہا۔"

"اسی لئے میرے سامنے قانون بگھار رہے تھے۔ میرا تجربہ کہتا ہے، ناکام جاسوس مایوسی کا شکار ہو کر خطرناک مجرم بن جاتا ہے۔ میں نیلما کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔"

"ہمارا جرم کیا ہے؟"

"یہ عدالت میں معلوم ہوگا۔"

"پھر تو میں نیلما کے ساتھ عدالت میں ملاقات کروں گا۔ آپ کارکردگی دکھانے کے لئے اتنے ہی بے چین ہیں تو گرفتاری کا وارنٹ لے آئیں۔"

وہ گرج کر بولا۔ "مجھے قانون مت سکھاؤ، میں شک کا فائدہ اٹھا کر حوالات میں ڈال سکتا ہوں۔ جیل بھجوا سکتا ہوں۔"

"کیا آپ کو نیلما پر شک ہے؟"

"بیشک ہے۔"

"آپ نے اس کا بیان اب تک نہیں لیا ہے۔"

انسپکٹر ذرا گڑبڑایا، پھر بولا۔ "میں قانون کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں، تم ناکام رہے ہو۔ میرا طریقۂ کار ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔ ہاں تو مس نیلما، تم نے کس رائفل سے اپنے دادا کو گولی ماری تھی؟"

نیلما نے کھلونا رائفل کی طرف اشارہ کیا۔ انسپکٹر نے غصے سے کہا۔ "زیادہ معصوم اور نادان بچی نہ بنو۔ یہ کھلونا ہے، اس سے کوئی مر نہیں سکتا۔"

وہ بولی۔ ''مرسکتا ہے۔ میں گولیاں چلاتی تھی۔ دادا جان تھوڑی دیر کے لئے مر جاتے تھے، پھر زندہ ہو جاتے تھے۔''

''تم بہت چالاک ہو۔ پاگل پن کا مظاہرہ کر کے قانون سے بچنا چاہتی ہو۔''

عاصمہ پھوپھی، نادرہ، زبیر اور تمام ملازم اس کی معصومیت کا یقین دلانے لگے۔

انسپکٹر کو قتل کے سلسلے میں کوئی چشم دید گواہ نہیں مل رہا تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اصلی رائفل پر نیلما کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔ وہ بے بسی سے بولا ''اچھی بات ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ نیلما مقدمے کے دوران حاضر رہا کرے گی؟''

ایسے ہی وقت غازی جمال الدین مرحوم کا وکیل عدالت سے ضمانت نامہ لے آیا۔

نیلما کی ضمانت میڈیکل رپورٹ کی بنا پر ہوئی تھی۔ مستند اور معروف ڈاکٹروں کے تحریری بیانات کے مطابق وہ ایسی دماغی مریضہ تھی جس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا البتہ شک کی بنا پر گرفتار کر کے اسے گھر کے مانوس ماحول سے دور کرنے پر دماغی صدمہ پہنچنے کا امکان تھا۔ اگر گرفتاری ضروری ہو تو پولیس کی نگرانی میں اسے گھر کی چار دیواری تک محدود رکھا جا سکتا تھا۔

انسپکٹر، وکیل اور زبیر کے ساتھ ایک کمرے میں آ کر ضمانت نامہ پڑھ رہا تھا پھر بولا۔ ''اچھی بات ہے، نیلما اس کوٹھی سے باہر نہیں جایا کرے گی لیکن مسٹر زبیر! آپ میرے ساتھ تھانے چلیں گے۔''

نادرہ نے دروازے پر آ کر کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

زبیر نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر وکیل کے ساتھ کمرے سے چلا گیا۔ نادرہ کے ہاتھ میں ایک پرس تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر انسپکٹر کے قریب بیٹھ کر بولی۔

''آپ زبیر کو تھانے لے جا کر پریشان کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن حوالات میں رکھیں گے۔ ہم دولت مند ہیں، اسے بھی ضمانت پر لے آئیں گے۔ آپ کبھی اسے قاتل ثابت نہیں کر سکیں گے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ میں اسے قاتل ثابت کر دوں گا۔ ہم پولیس والے ایسا کام چٹکی بجا کر کرتے ہیں۔''

''میں بھی چٹکی بجا کر ثابت کر دوں گی کہ واردات کے وقت زبیر میری خواب گاہ میں تھا۔ کوئی لڑکی اتنی نادان اور بے حیا نہیں ہوتی کہ کسی کے ساتھ بدنام ہو جائے، میں زبیر کو بچانے کے لئے بدنامی کو ترجیح دوں گی۔''

انسپکٹر اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اس نے پرس کھول کر نوٹوں کی ایک گڈی نکالی، پھر آہستگی سے کہا۔ ''میں نے اسی لئے دروازہ بند کیا ہے، کوئی دیکھنے والا نہیں۔ یہ پانچ ہزار ہیں۔ زبیر کا خیال چھوڑ دیجئے اور پانچ ہزار پکڑ لیجئے۔ اس طرح آپ اصل قاتل کی طرف دھیان دے سکیں گے۔''

انسپکٹر نوٹوں کی بھاری گڈی کو دیکھ رہا تھا۔ یقین کرنا چاہتا تھا، یہ مال اس کے ہی نصیب میں ہے۔ نادرہ نے کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہتی ہوں، یہ بات زبیر کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ آپ اسے چپ چاپ رکھ لیں۔''

اس نے چور نظروں سے دروازوں اور کھڑکیوں کو دیکھا۔ جب یقین ہو گیا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو اس نے جلدی سے گڈی لے کر جیب میں ٹھونس لی۔ بعد میں دروازے کی چوکھٹ کے اوپر نظر گئی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ''اللہ دیکھ رہا ہے۔''

☆======☆======☆

آپ فرمائیں گے، دریا الٹا نہیں بہہ سکتا۔ شاید نہ بہتا ہو۔ آپ دعویٰ کریں گے سوکھے کنوئیں سے پانی نہیں نکلتا۔ شاید نہ نکلتا ہو لیکن آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ایک بوڑھی عورت اپنے سوکھے سینے سے ایک لڑکی کو دودھ پلا سکتی ہے۔

قصہ یوں ہے کہ نیلما پیدا ہونے کے چھ ماہ بعد اپنی ماں سے محروم ہو گئی تھی۔ اسے اوپری دودھ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے دادا جان نے عاصمہ کو حکم دیا کہ وہ دودھ پلایا کرے۔ عاصمہ اپنے بیٹے ارباب کو نیلما سے منسوب کرنا چاہتی تھی تاکہ باپ کی دولت کا کچھ حصہ وہ لڑکی باہر نہ لے جائے لیکن وہ بالشت بھر کی لڑکی روتے روتے جان دے رہی تھی۔ اس کے دادا جان کو ناراض بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اس نے مجبور ہو کر اسے اپنی ممتا بھری چھاتی سے لگا لیا۔ ان دنوں نادرہ دو برس کی تھی۔ وہ بھی ماں کا دودھ پیتی تھی اور ماں دونوں میں اپنی ممتا برابر تقسیم کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

وہ عورت جو بھائی کی بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھی۔ جسے دولت کی تقسیم منظور نہیں تھی۔

وہ بھلا اپنی ممتا کیسے تقسیم کرسکتی تھی۔ گوالے دودھ میں پانی ملاتے ہیں، وہ دودھ میں زہر ملانے لگی۔

اس قصے کے پیچھے بھی ایک دلچسپ قصہ ہے جسے سمجھے بغیر دودھ اور زہر کا معاملہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ کوئی پینتالیس یا پچاس برس پہلے کی بات ہے، جب نیلما کا وجود نہ تھا اور اس کے دادا غازی جمال الدین بانکے جوان تھے۔ ان کے ہاں پہلے ایک بیٹا غازی کمال الدین پیدا ہوا۔ تین برس بعد بیٹی عاصمہ پیدا ہوئی۔ دونوں بچوں میں کوئی جسمانی عیب نہیں تھا، وہ بظاہر مکمل اور خوبصورت تھے مگر کسی خاص وقت سے پہلے قدرتی حالات سمجھ میں نہیں آتے۔ جب عاصمہ جوان ہونے لگی تو اسے پتا چلا کہ جسمانی نشوونما میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ وہ بظاہر مکمل ہوتے ہوئے بھی کچھ نامکمل ہے مگر اس کا ذکر وہ کسی سے نہیں کرسکتی تھی۔

جوان بیٹی ایسی بات اپنی ماں سے ہی کرسکتی تھی اور ماں اس کے جوان ہونے سے پہلے مرچکی تھی۔ باپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ اسے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی لیکن باپ چاہے جس قدر ماں بن کر پیار کرے، وہ ماں کی طرح راز دار سہیلی نہیں بن سکتا۔ وہ اپنی جسمانی کمی چھپانے کے لئے ڈھیلی قمیض پہنا کرتی تھی۔ سینے پر چادر نما بڑا سا دوپٹہ ڈالے رکھتی تھی تاکہ دیکھنے والوں کو عیب نظر نہ آئے۔

کوئی اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتا۔ وہ تنہائی میں اپنے سراپا کا جائزہ لیتی رہتی تھی اور پریشان ہوکر سوچتی تھی۔ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی کے سامنے یہ بات کھلے گی تو کتنی شرم آئے گی۔ محرومی کا احساس اسے مار ڈالے گا۔ اسے ہونے والے شوہر کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ باپ کے پاس بے انتہا دولت تھی، کوئی بھی اس کی ایک جسمانی کمی کو نظر انداز کرسکتا تھا۔

اسے صدمہ اس بات کا تھا کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح دولت کے غرور میں سینہ تان کر نہیں چل سکتی تھی۔ بدلتے ہوئے فیشن کے مطابق نت نئی تراش کے چست لباس نہیں پہن سکتی تھی۔ ڈھیلی قمیض پہن کر آئینہ دیکھتی تھی اور خود کو بڑی بی دکھائی دیتی تھی۔

آخر اس نے بچپن کی ایک سہیلی رضوانہ کو اپنا ہمراز بنایا۔ رضوانہ کے والد ایک معروف ڈاکٹر اور ماہر نفسیات تھے۔ وہ بھی باپ کا پیشہ اختیار کرنا چاہتی تھی۔ میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس نے عاصمہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں

ہے جس کے لئے تم پریشان رہا کرو۔ سب سے پہلے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ کمی قدرتی ہے۔ تم دوا سے یا دعا سے اس کمی کو پورا نہیں کرسکو گی۔“

”یہ تو میں تسلیم کرتی ہوں۔“

”تم نے دیکھا ہوگا، جس کی ٹانگ کٹ جاتی ہے، وہ مصنوعی ٹانگ لگا لیتا ہے۔ جس کی آنکھوں سے بینائی جاتی رہے، اسے دوسری آنکھیں مل جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ دل ناکارہ ہو جائے تو مصنوعی دل بھی لگایا جاتا ہے۔ لوگوں کے پاس سینہ ہوتا ہے، دل نہیں ہوتا۔ تمہارے پاس دل ہے، سینہ نہیں ہے۔ اس کا کوئی غم نہیں ہونا چاہئے۔ دولت بازار سے سب کچھ خرید لیتی ہے۔ تم تفریح کی خاطر بنکاک، ہانگ کانگ، لندن یا پیرس جاؤ۔ وہاں حسب منشا کمی پوری ہوگی۔ واپس آؤ گی تو بھرپور دوشیزہ نظر آؤ گی۔“

”تم نے میری آدھی پریشانی دور کردی۔ اب تیار ہو جاؤ! اپنے ڈیڈی سے باہر جانے کی اجازت حاصل کرو۔ میں اپنے اخراجات پر تمہیں بنکاک لے جاؤں گی۔“

”ہمارے والدین اتنے ماڈرن نہیں ہیں کہ وہ لڑکیوں کو تنہا جانے کی اجازت دیں۔“

”میں ڈیڈ کو ساتھ لے چلوں گی لیکن ہم شاپنگ کے وقت تنہا رہا کریں گے۔ اس طرح میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

بات طے ہوگئی، اس پر عمل بھی ہوا۔ دو ہفتے بعد ہی عاصمہ نے ضد کرتے کرتے اپنے ڈیڈ کو بنکاک چلنے پر مجبور کر دیا۔ تیسرے ہفتے وہ رضوانہ کو ساتھ لے کر گئی۔ غازی جمال الدین نے وہاں پہنچ کر لڑکیوں کو شاپنگ کی اجازت دی۔ انہوں نے پانچ دن تک قیام کیا۔ واپسی پر انہیں اپنی بیٹی میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی، وہ فوراً تو سمجھ نہیں پائے۔ پھر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ عاصمہ کو پہلی بار نئے فیشن کے چست لباس میں دیکھ رہے ہیں۔ والدین ایسی تبدیلی گوارا نہیں کرتے لیکن وقت کے تقاضوں سے مجبوراً سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ عاصمہ کو احساس کمتری سے نجات مل گئی تھی۔ اب وہ کسی بھی تقریب میں چوروں کی طرح بدن نہیں چراتی تھی۔ دولت مند مغرور حسینہ کی طرح اکڑ کر چلتی تھی۔ چادر نما دوپٹہ اتار کر پھینک دیا تھا۔ اب وہ ایسے لباس پہنتی تھی جس میں دوپٹے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر ایک جوان نے قریب آ کر سرگوشی میں کہا۔ ”غبارے کتنے ہی غرور سے پھول

جائیں۔ ایک دن ہوا نکل ہی جاتی ہے۔''

عاصمہ بات سمجھ نہیں پائی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ نوجوان نے کہا۔

''خاکسار کو علاؤالدین چنگیزی کہتے ہیں۔ اس محفل میں سبھی ایک دوسرے سے ہنس بول رہے ہیں۔ کیا ہم آپس میں گفتگو کر سکتے ہیں؟''

''سوری، میں کسی اجنبی سے بات نہیں کرتی۔''

''میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ آپ میرے لئے نہیں ہیں۔ میں آپ کو بہت دور تک جانتا ہوں۔''

''یہ دور تک جاننے کا مطلب کیا ہوا؟''

''مطلب یہ کہ اس ملک سے باہر تک۔ یعنی بنکاک تک آپ کو جانتا ہوں۔''

عاصمہ ایک دم سے چونک کر پیچھے ہٹ گئی، وہ بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ کا راز میرے سینے میں دفن ہے۔ یہ میری زبان پر نہیں آئے گا۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''تم کون ہو؟ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کچھ نہیں جانتی۔''

''میں آپ کی بہتری چاہتا ہوں۔ آپ کو بھی اپنی بہتری کے لئے مجھ سے گفتگو کرنا چاہئے۔''

''اگر میں نہ کرنا چاہوں تو؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''رضوانہ میری کزن ہے۔''

''اچھا تو رضوانہ نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ میں ابھی جا کر اس سے پوچھوں گی۔''

''آپ اس سے پوچھ کر مجھ سے دشمنی کریں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ دشمنی کے جواب میں آپ کے ڈھول کا پول ظاہر کر دوں۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا، اگر پول کھل جائے تو ابھی غرور سے تن کر چلنے والی چشم زدن میں کبڑی عورت کی طرح جھک جائے گی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک میز کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ہر میز پر کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ کچھ لوگ چلتے پھرتے کھا رہے تھے، کچھ آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے کھانے سے شغل کر رہے تھے۔

چنگیزی نے اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے رضوانہ کی ڈائری چرا

کر پڑھی تھی۔ یوں تمہاری کچھ ہسٹری معلوم ہو گئی۔ فار گاڈ سیک مجھے کوئی بلیک میلر نہ سمجھنا۔''

''بلیک میلر ہوئے بھی تو میرا کیا بگاڑ لو گے؟''

''تمہارا نہیں، میرا بگڑے گا۔ رضوانہ کو معلوم ہوگا کہ میں نے اس کی ڈائری چرا کر پڑھی ہے تو میں شرم سے منہ نہیں دکھا سکوں گا۔''

''ایسے ہی شرم والے ہو تو ڈائری چرائی کیوں؟''

''میں ایک شریف آدمی ہوں، ایسا ہرگز نہ کرتا۔ یہ رضوانہ کی بے پروائی ہے، وہ اپنی میز پر اسے کھلا چھوڑ کر باتھ روم میں گئی تھی، اسی وقت میں پہنچ گیا۔ مجھے کچھ لکھنے کے لئے قلم کی ضرورت تھی۔ قلم لینے کے لئے میز کے پاس گیا تو ڈائری کے کھلے ہوئے ورق پر تمہارے متعلق پہلی سطر قابلِ توجہ تھی۔ میں نے دوسری سطر پڑھی۔ پھر تیسری پڑھی۔ میں خود سمجھ نہ پایا کہ کس طرح بے اختیار پڑھتا جا رہا ہوں۔ مجھے باتھ روم کے اندر آہٹ سنائی دی۔ میں ڈائری اٹھا کر وہاں سے چلا آیا۔''

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ تم نے ڈائری کیوں چرائی؟''

''میرے اندر کے شریف آدمی نے کہا۔ اگر رضوانہ ایسی ہی بے پروا رہے گی تو تمہارا راز کم ظرف لوگوں تک پہنچ جائے گا۔ کوئی پیٹھ پیچھے بھی تمہارا مذاق اڑائے، میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے میں نے وہ ڈائری چرانے کے بعد جلا دی۔ اب تم پر آنچ نہیں آئے گی۔''

عاصمہ نے ایک دم سے متاثر ہو کر اسے دیکھا، پھر پوچھا۔ ''آپ...... آپ نے...... آپ نے یہ سب کچھ میری خاطر کیا ہے؟ مگر کیوں؟''

''میں ایک عرصے سے تمہیں جانتا ہوں۔ میری آنکھ تمہیں دیکھتی ہے۔ میرا دل تمہارے نام سے دھڑکتا ہے۔ تم بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ میں ایک معمولی بزنس مین ہوں۔ تم آسمان ہو، میں زمین ہوں۔ تمہیں چھونے کا حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب تمہارا کیس معلوم ہوا تو خیال آیا، تمہیں ایسے جیون ساتھی کی ضرورت ہے جو ہمیشہ راز دار بن کر رہے کیونکہ یہ بات صرف ڈائری تک محدود نہیں رہے گی۔ رضوانہ دوسری ڈائری لکھ سکتی ہے اور اس کے بعد بھی بڑے مسائل پیش آ سکتے ہیں۔''

''کیسے مسائل؟''

''ٹو بی ویری فرینک، تمہیں کسی نہ کسی سے شادی کرنا ہے۔ تمہارا یہ راز کم از کم اپنے

شوہر سے چھپا نہیں رہے گا۔ لہٰذا کسی راز دار کو ہی اپنا جیون ساتھی بنانا چاہیئے۔''

وہ سر پر آنچل رکھ کر نظریں چرا رہی تھی۔ کہنے والا درست کہہ رہا تھا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ایک اجنبی اچانک اس کا راز دار بن کر آ جائے گا اور وہ تو کھلے لفظوں میں کہہ رہا تھا کہ کسی راز دار کو ہی اس کا جیون ساتھی بننا چاہیئے۔

وہ میز پر جھک کر آہستگی سے بولا۔ ''مجھ میں کوئی جسمانی عیب نہیں ہے، تم میرا میڈیکل سرٹیفکیٹ دیکھ سکتی ہو۔ مجھ میں کوئی بیماری نہیں ہے۔ میں سر سے پاؤں تک خوب صورت نہ سہی مگر قابلِ قبول ہوں۔ کیا تم مجھے قبول کر سکتی ہو؟''

عاصمہ نے محسوس کیا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں بہت زیادہ متاثر ہو رہی ہے۔ ایک اجنبی نے اتنی جلدی کیسے متاثر کر لیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تجزیہ کرنے پر دو ہی باتیں اہم ہو سکتی تھیں۔ ایک تو وہ راز دار بن چکا تھا۔ دوسرے اس کی عزت اور انا کا خیال رکھتے ہوئے اس ڈائری کو جلا چکا تھا جو کسی کے بھی ہاتھ لگ سکتی تھی۔ اس کا یہی عمل ایسا تھا جس نے عاصمہ کو متاثر کر دیا تھا۔

پھر بات آگے بڑھنے میں دیر نہیں لگی۔ چنگیزی کے والدین اس کا رشتہ مانگنے آئے تو اس کے ڈیڈی نے انکار نہیں کیا۔ یہ بات رضوانہ کو معلوم ہوئی تو وہ چکرا کر رہ گئی۔ اس نے چنگیزی کو تنہائی میں ملنے کے لئے کہا لیکن وہ ٹال گیا۔ وہ اس کے گھر گئی تو ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا، غصے سے بولی۔ ''چنگیزی! کیا تم مجھے دھوکا دے رہے ہو، کیا واقعی عاصمہ سے شادی کر رہے ہو؟''

''میرے گھر والوں کو عاصمہ پسند ہے۔ مجھے افسوس ہے، میں تمہارے ساتھ زیادہ چل نہ سکا۔''

''تم بہت گرے ہوئے انسان ہو، مجھ سے زیادہ دولت مند لڑکی دیکھ لی۔ یہ بھی خیال نہ کیا، رضوانہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا۔''

''میں مانتا ہوں، تم نے سب کچھ کیا ہے۔ میری تنہائی کی ساتھی رہی ہو لیکن ایک بات یاد رکھو، جو عورت ایک مرد کی تنہائی میں کسی دوسری عورت کا راز بیان کرتی ہے، اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہوتی۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''کیا تم نے عاصمہ کو بتایا ہے کہ اس کا راز میں نے تمہارے سامنے بیان کیا تھا؟''

''میں احمق نہیں ہوں۔ اگر عاصمہ سے یہ کہتا کہ رضوانہ نے یہ باتیں اپنی زبان سے بتائی ہیں تو اس کا مطلب ہوتا کہ تم میری تنہائی میں آ کر بے تکلفی سے وقت گزارتی ہو۔ میں نے ایسا کوئی قصہ بیان نہیں کیا صرف یہ کہا کہ میں نے تمہاری ڈائری میں اس کے متعلق پڑھا تھا۔''

''میں نے کبھی کوئی ڈائری نہیں لکھی۔''

''میں نے جو کہانی اس کے سامنے بیان کی، اس میں ڈائری کا اضافہ کر دیا اور تمہیں اپنی تنہائی سے ہٹا دیا تاکہ عاصمہ کے سامنے ایک مہذب نوجوان کی حیثیت سے قابلِ قبول بن جاؤں اور میں بن چکا ہوں۔''

رضوانہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ چپ چاپ ریسیور رکھ دیا۔ وہ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی کہ چنگیزی کے قریب آ کر اپنا سب کچھ لٹا چکی ہے۔

جب تک مرد کا فریب نہیں کھلتا تب تک وہ اپنا ہی لگتا ہے۔ اس قدر اپنا لگتا ہے کہ عورت اپنی کوئی بات اس سے نہیں چھپاتی بلکہ اپنی بات کرتے کرتے دوسری عورتوں کی باتیں بھی کرنے لگتی ہے۔ کتنی زبردست ٹھوکر کھانے کے بعد عقل آئی تھی کہ ایک مرد کتنا ہی وفادار اور محبت کرنے والا ہو۔ اسے دوسری عورت کا راز کبھی نہیں بتانا چاہیئے۔

وہ شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی، آگے اس کا مستقبل شاندار تھا۔ ایک بڑی ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ان حالات میں خود کو بدنام کرنا گوارا نہیں تھا۔ دانشمندی یہی تھی کہ چپ چاپ چنگیزی کے راستے سے ہٹ جائے۔ وہ نہایت شاطر تھا۔ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ رضوانہ جیسی شریف لڑکیاں اندر ہی اندر تلملا کر رہ جاتی ہیں لیکن بدنام ہونا پسند نہیں کرتیں۔

بہرحال، چنگیزی اور عاصمہ کی شادی ہو گئی۔ غازی جمال الدین نے اپنے داماد کو بڑی بڑی رقمیں دیں تاکہ اپنے بزنس کو بڑھاتا رہے لیکن وہ ہمیشہ ناکام رہا۔ ایک برس بعد عاصمہ ماں بن گئی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام ارباب چنگیزی رکھا گیا لیکن جنم دینے سے پہلے ہی یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ بچے کو دودھ نہیں پلا سکے گی اور غازی جمال الدین کہتے آئے تھے۔ ''ہمارے خاندان کی ہر عورت بچے کو اپنا دودھ پلاتی ہے۔'' ان کا

خیال تھا کہ ڈبے کا دودھ اولاد کا خون سفید کر دیتا ہے۔

چنگیزی نے تنہائی میں عاصمہ کو سمجھایا۔ ''بھئی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، ہم چپ چاپ ڈبے کا دودھ لا کر کمرے میں رکھیں گے۔ تم ابتدا ہی سے یہ بات دوسروں کے دماغ میں نقش کر دو کہ سب کے سامنے دودھ پلاتے شرم آتی ہے لہٰذا اپنے کمرے میں پلایا کرو گی۔ یوں بھی تمہارے والد بچے کو دودھ پیتے دیکھنے نہیں آئیں گے، وہ تو دوسروں سے سنیں کہ تم اسے اپنا دودھ پلا رہی ہو۔''

چنگیزی نے جس طرح سمجھایا اسی طرح بات بننے لگی۔ بیٹا پیدا ہونے کے بعد وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ بچہ اکثر اپنے نانا کی گود میں کھیلتا تھا، جب بھوک سے وہ رونے لگتا تو وہ کہتے۔ ''لو بیٹی! دیکھو، ہمارا نواسہ بھوکا ہے، اسے دودھ پلاؤ۔''

وہ فوراً بچے کو لے کر اپنے کمرے کی طرف چلی جاتی۔ تب غازی جمال الدین ہنستے ہوئے کہتے تھے۔ ''ہماری بیٹی بہت شرمیلی ہے اور مشرقی لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔''

ایک بیٹے کی پیدائش پر یہ بات بن گئی۔ وہ اپنے کمرے میں چھپ چھپ کر اسے اوپری دودھ پلایا کرتی تھی۔ دو برس بعد پھر ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نادرہ رکھا گیا۔ اسے بھی چھپ چھپ کر ڈبے کا دودھ پلانا شروع کیا لیکن چار ماہ بعد ایک نئی مصیبت پیش آ گئی۔

ہوا یہ کہ عاصمہ کے بھائی کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نیلما رکھا گیا۔ اس کے پیدا ہونے کے چھ ماہ بعد ہی ماں اس دنیا سے چل بسی۔ غازی جمال الدین نے بیٹی کو حکم دیا کہ وہ نیلما کو دودھ پلائے۔

عاصمہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈ! میں نیلما کو دودھ نہیں پلا سکتی۔''

''کیا حرج ہے؟''

''میں اسے بہو بنانا چاہتی ہوں۔ آپ میرے بیٹے سے نیلما کو منسوب کیجئے۔''

''تمہیں بہو بنانے کی سوجھ رہی ہے جب کہ یہ بے چاری دودھ کے لئے بلک بلک کر رو رہی ہے۔ تم جانتی ہو، ہمارے خاندان کی عورتیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ نیلما بھی ہمارے ہی خاندان کی عورت کا دودھ پیئے گی لہٰذا اسے لے جاؤ اور دودھ پلاؤ۔''

باپ کے حکم کے بعد بحث کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر وہ کچھ بولنا بھی چاہتی تو نیلما روئے جا رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ پھر جھنجھلا کر اسے بستر پر پٹخ دیا۔ چنگیزی نے

کہا۔ ''اس طرح غصہ دکھانے سے کام نہیں بنے گا۔ باپ کا دل جیتنا ہے تو ان کے حکم کی تعمیل کرو۔''

''لیکن ڈیڈ تو یہی سمجھیں گے کہ نیلما اور ارباب دودھ شریک بھائی بہن ہیں۔ آئندہ ان کی شادی نہیں ہو سکے گی۔''

''ڈیڈ کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، تم سچ مچ دودھ نہیں پلا رہی ہو۔ اسے بھی اوپری دودھ پلاؤ گی؟''

''لیکن یہ میری بہو کیسے بنے گی؟''

''ہم اپنے ہاتھوں سے تقدیر بنانا چاہیں گے تو شاید بہو بن جائے۔ تمہارے باپ کی زندگی کتنی ہو سکتی ہے؟''

وہ چونک کر بولی۔ ''کیا مطلب؟''

''باپ کی دولت حاصل کرنا چاہتی ہو تو نیلما کو بہو بنانا لازمی ہے۔ اس مقصد کے لئے باپ کی زبان بند رکھنا چاہئے تاکہ وہ کسی کو یہ نہ بتا سکیں کہ تم نے اسے دودھ پلایا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو، میرے باپ کی زبان کس طرح بند ہو گی؟''

''دو ہی طریقے ہیں، یا تو وہ ہمیشہ کے لئے گونگے ہو جائیں یا ہمیشہ کے لئے سو جائیں۔''

وہ چنگیزی کا منہ تکتے ہوئے سوچتی رہ گئی۔ اسے اپنے شوہر کی بات بری لگی تھی۔ وہ اس کے باپ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی بات کر رہا تھا۔ ایسا تو دشمن کرتے ہیں۔ وہ چنگیزی کو دشمن نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ وہ تمام دولت سمیٹنے کے راز بتا رہا تھا، اس کی اور اولاد کی بھلائی کے لئے ایسے مشورے دے رہا تھا۔

اس نے عاصمہ کو سوچ میں گم دیکھا تو جلدی سے کہا۔ ''تم میرے متعلق غلط رائے قائم نہ کرنا۔ میں نے یونہی ایک بات کہہ دی ہے۔ جب ہمیں دولت غلط راستے سے حاصل کرنا ہو گی تب ایسا سوچیں گے ورنہ ابھی انتظار کریں گے اور دیکھیں گے کہ تقدیر ہمارے حق میں کیا گل کھلاتی ہے۔''

عاصمہ اس دن سے نیلما کو بھی بند کمرے میں دودھ پلانے لگی۔ وہ بہت روتی تھی۔ ادھر اپنی بیٹی نادرہ بھی پریشان کرتی تھی۔ دونوں کو بیک وقت سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس

مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے نیلما کے دودھ میں افیون کی ہلکی سی مقدار ملانا شروع کردی۔ نیلما کا باپ غازی کمال الدین اپنے باپ کا کاروبار سنبھالتا تھا، اسے اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ بیٹی کی طرف توجہ دے سکے۔ یوں بھی اطمینان تھا کہ اپنی سگی بہن پرورش کررہی ہے اسے اپنی گود میں رکھ کر دودھ ہی پلائے گی زہر نہیں پلائے گی۔

تین برس بعد باپ کو تشویش ہوئی۔ بیٹی بولتی نہیں تھی اور گونگی بھی نہیں تھی۔ اس نے بہن سے پوچھا۔'' عاصمہ، یہ بولتی کیوں نہیں ہے۔ تین برس کے بچے کچھ نہ کچھ تو بول ہی لیتے ہیں۔''

''بعض بچے دیر سے بولتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، یہ بولنے لگے گی۔''

وہ پانچ برس کی عمر میں بولنے لگی لیکن پڑھنے میں بالکل ہی کند ذہن تھی، نہ اسے گنتی یاد ہوتی تھی، نہ ہی کوئی پڑھایا ہوا سبق یاد رہتا تھا لیکن ایک بات عجیب تھی، جب عاصمہ اس سے کہتی۔'' نیلما! اگر تم ایک سے دس تک گنتی یاد کرلوگی تو پھر تمہیں دودھ پلاؤں گی۔'' تب وہ حیرت انگیز طور پر یاد کرلیتی تھی۔ باپ نے حیرانی سے پوچھا۔'' یہ چھ برس کی ہورہی ہے اور تم ابھی تک دودھ پلاتی ہو اسے!''

عاصمہ نے کہا۔''میں اسے بھائی کی نہیں، اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔ یہ مجھ سے جتنا لاڈ کرتی ہے، میں اتنا ہی اسے پیار کرتی ہوں۔ یہ جو چاہتی ہے، اس کی فرمائش پوری کرتی ہوں۔ دودھ کے لئے مچلتی ہے تو اسے روتا ہوا دیکھ نہیں سکتی، اس لئے کلیجے سے لگا لیتی ہوں۔''

بھائی اپنی بہن کی اس ممتا سے متاثر ہوتا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ نیلما چھ برس کی عمر میں بھی دودھ پیتی ہے۔ اگر وہ زندہ رہ جاتا تو یہ معلوم کرکے اور زیادہ حیران ہوتا کہ نیلما جوان ہونے کے بعد بھی عاصمہ کے سینے سے جا لگتی ہے اور دودھ پینے کی ضد کرتی ہے۔

جب وہ سات برس کی ہوئی تو باپ مرگیا۔ اس کے بعد وہ جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتی رہی، عاصمہ اسے سمجھاتی رہی۔'' دیکھو نیلما! تم میرے سینے سے لگ کر دودھ پینے کی بات کسی کے سامنے کروگی تو میں دودھ نہیں پلاؤں گی۔''

وہ دودھ کیا تھا نشہ تھا جس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتی تھی۔ اس کی خاطر وہ عاصمہ کی ہر بات پر عمل کرتی تھی۔ اگر کوئی بات کسی کے سامنے کہنے سے منع کردی جاتی تو وہ کبھی اسے

زبان پر نہیں لاتی تھی۔ دادا تو یہی سمجھ رہا تھا کہ دودھ پینے کی عمر گزر چکی ہے۔ اگر نیلما اپنی آنٹی عاصمہ سے زیادہ مانوس ہے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے، اس نے ایک تو عاصمہ کا دودھ پیا ہے، دوسرے اس کے سائے میں پرورش پائی ہے۔

ادھر عاصمہ نے اپنے باپ کی تمام دولت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے چنگیزی کے ہر مشورے پر عمل کیا تھا۔ نیلما کے دودھ میں افیون دے کر بچپن سے اب تک اسے غبی اور کند ذہن بنادیا تھا تاکہ اس کے ماموں کا لڑکا زبیر اس میں دلچسپی نہ لے۔ دوسری طرف اپنی بیٹی نادرہ کو ڈھیل دے دی کہ وہ اپنی زلفوں میں اسے الجھاتی رہے۔ اپنے بیٹے ارباب چنگیزی کو سمجھادیا کہ وہ نیلما کے بچگانہ پن پر نہ جائے صرف دولت کا منہ دیکھے تو نیلما کا منہ بھی اچھا لگے گا اور وہ اسے دلہن بنالے گا۔

اس کے لئے ایک مناسب وقت کا انتظار تھا اور وہ وقت قریب آرہا تھا۔ ادھر زبیر، نادرہ کا اسیر ہوتا جارہا تھا، اگرچہ وہ بچپن ہی سے نیلما سے منسوب ہوچکا تھا۔ جوان ہونے پر دادا جان نے ایک بار پھر اس نکاح نامے پر ان کے تصدیقی دستخط لے لئے تھے۔ اس کے باوجود وہ نادرہ کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا تھا۔ البتہ نیلما پر توجہ دیتا تھا۔ اس کی توجہ میں صرف ہمدردی تھی یا محبت بھی تھی، اس کا اندازہ کوئی نہ کرسکا۔ وہ ہمیشہ یہ معلومات رکھتا تھا کہ نیلما کس طرح زندگی گزار رہی ہے، اس کے رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں کسی قسم کی کوتاہی تو نہیں ہورہی ہے؟

عاصمہ اور چنگیزی اس بات کا پورا خیال رکھتے تھے کہ زبیر کو کسی قسم کا شبہ نہ ہونے پائے۔ ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ زبیر کو سراغرساں بننے کا خبط ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ انٹیلی جنس بیورو کے ٹریننگ سینٹر میں تربیت بھی حاصل کررہا ہے۔ یہ بات بڑی پریشان کن تھی۔ دونوں میاں بیوی اور زیادہ محتاط ہوگئے تھے۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا، جب ان کی بے اطمینانی ختم ہوگئی۔ انہیں پتا چلا کہ زبیر نے ٹریننگ ضرور حاصل کی ہے لیکن امتحان میں ناکام رہا ہے۔ اسے انٹیلی جنس بیورو میں کسی قسم کی ملازمت نہیں مل سکے گی۔

یہ اطمینان ہوگیا لیکن ایک بات پھر بھی پریشان کن تھی۔ نیلما غبی، کند ذہن ہونے کے باوجود زبیر سے متاثر تھی۔ اس کی ہر بات مانتی تھی۔ اسے دن میں ایک بار دیکھ نہ لیتی تو

پوچھتی رہتی۔ زبیر کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟ وہ کب آئیں گے؟

عاصمہ اس سے کرید کرید کر پوچھتی تھی کہ وہ زبیر سے کس قسم کی باتیں کرتی ہے اور زبیر اس سے کس قسم کے سوالات کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی آنٹی عاصمہ کو ساری باتیں بتا دیا کرتی تھی۔ اگر کوئی بات چھپانا چاہتی تو عاصمہ اسے دھمکی دیتی۔ ''میں تمہیں دودھ نہیں پلاؤں گی۔''

یہ بہت بڑا ہتھیار تھا، نیلما پریشان ہو جاتی تھی، جو بات زبیر بتانے کے لئے منع کرتا، وہ بھی بتا دیتی تھی۔ عاصمہ نے اسے اچھی طرح تاکید کی تھی۔ ''زبیر کو ہر بات بتانا لیکن یہ کبھی نہ بتانا کہ تم آج بھی میرے سینے سے لگ کر دودھ پیتی ہو اور جب تک دودھ نہیں پیتی ہو تمہیں نیند نہیں آتی۔''

یہ بات نیلما نے گرہ میں باندھ لی تھی، یہ اسے ایسے یاد تھی جیسے کوئی اہم سبق یاد رہتا ہے، جسے انسان زندگی بھر نہیں بھولتا۔

جی ہاں، ایسے ہی موقع پر آپ فرمائیں گے۔ دریا الٹا نہیں بہہ سکتا۔ شاید نہ بہتا ہو۔ ایسے ہی موقع پر آپ دعویٰ کریں گے۔ سوکھے کنوئیں سے پانی نہیں نکل سکتا، شاید نہ نکلتا ہو لیکن اب آپ کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ایک بوڑھی عورت اپنے سوکھے سینے سے ایک جوان لڑکی کو دودھ پلاتی ہے۔

☆======☆======☆

مقدمہ جاری تھا۔ نیلما، زبیر، نادرہ، عاصمہ، علاؤالدین چنگیزی اور ارباب چنگیزی کی پیشی ہوتی رہتی تھی اور وہ پیش ہو کر عدالت میں ہونے والے سوالات کے جواب دیتے رہتے تھے۔ یہ کیس اخبارات والوں کے لئے بھی نہایت دلچسپ تھا۔ انہوں نے پہلے ہی دن شہ سرخیوں میں یہ خبر شائع کی تھی کہ ایک دوشیزہ نے کھلونا رائفل سے اپنے دادا جان کو قتل کر دیا۔

لاش کی کھوپڑی سے نکلنے والی گولی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ سیون ایم ایم کی رائفل سے ہلاک کئے گئے ہیں لیکن وہ رائفل کس نے چلائی؟ اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا اور نیلما کا بیان شروع سے وہی تھا۔ ''میں نے دادا جان کو اپنی کھلونا رائفل سے گولی ماری تھی اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ تھوڑی دیر مرنے کے بعد زندہ ہو جائیں گے۔''

اس کے بچگانہ بیانات پر عدالت کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ ملزمہ کا طبی معائنہ کرایا جائے۔ اگر وہ دماغی طور پر صحت مند نہیں ہے، غبی اور کند ذہن ہے تو ایسا کیوں ہے؟

علاؤالدین چنگیزی اور اس کے بیٹے ارباب چنگیزی سے پوچھا گیا۔ وہ باپ بیٹے واردات کے دن کہاں تھے؟ انہوں نے بیان دیا۔ وہ ملتان میں تھے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے وہ ٹکٹ دکھایا جس کے ذریعے طیارے میں سفر کیا تھا اور ملتان گئے تھے۔ وہاں سے واپسی کا ٹکٹ بھی تھا۔ یہ بھی دعویٰ کیا کہ ملتان میں جن رشتے داروں کے ہاں جس گھر میں، جس محلّے میں گئے تھے، وہاں ان کی موجودگی کے سلسلے میں تصدیق کرائی جا سکتی ہے۔

وہ باپ بیٹے شہادت کے دائرے سے نکل رہے تھے، عاصمہ پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ملازموں نے گواہی دی۔ جس وقت گولی چلنے کی آواز سنائی دی، اس وقت مالکن عاصمہ ان سے ڈائننگ روم کی صفائی کرا رہی تھیں۔ چنگیزی کو عدالت میں پیش ہونے سے پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ واردات کے وقت زبیر اور نادرہ ایک کمرے میں تھے۔ یہ بات وہ ایک باپ کی حیثیت سے اور ارباب چنگیزی ایک بھائی کی حیثیت سے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے نادرہ پر بہت غصہ دکھایا اسے مارنے کی دھمکیاں دیں، اسے سمجھایا کہ وہ اپنا بیان بدل دے اور یہ کہہ دے کہ زبیر اس کے کمرے میں نہیں تھا۔

زبیر تو اس کے دل میں تھا۔ بھلا وہ کیسے کہہ دیتی کہ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے بیان بدلنے سے انکار کر دیا۔ زیادہ غصہ دکھانے پر کہنے لگی۔ ''میں نادان بچی نہیں ہوں۔ آپ لوگوں کی چالیں خوب سمجھتی ہوں۔ آپ نے بھائی جان سے نیلما کی شادی کرنے کے لئے زبیر کو اس سے دور کرنا چاہا اور اس کا ایک ہی راستہ سمجھ میں آیا کہ زبیر مجھ سے گھل مل جائے۔ آپ لوگوں نے ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی آزادی دی۔ اب ہم آزادی کی تمام حدود پھلانگ چکے ہیں تو مجھے بیان بدلنے پر کیوں مجبور کر رہے ہو؟''

باپ نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ''یہ بے غیرتی ہے۔ تم بھری عدالت میں ایسا بیان دو گی تو ہم شرم سے مر جائیں گے۔''

''میں کوئی شرمناک بیان نہیں دوں گی۔ پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ پچھلے سال کا پرچا حل کر رہی تھی اور زبیر میری مدد کر رہے تھے ہم آپس میں کزن ہیں۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا حق رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا۔''

گھر میں باپ بیٹی کے درمیان جھگڑے ہوتے رہے لیکن عدالت میں ماں کو اس بیان کی تصدیق کرنا پڑی کہ میری بیٹی، زبیر سے پرچے حل کروا رہی تھی، اس طرح گھر کے تمام افراد شبہات سے بالاتر ہو گئے تھے۔ نیلما کی بھی میڈیکل رپورٹ آ گئی تھی۔ اس رپورٹ میں بھی وہی بات کہی گئی تھی جواب سے ایک برس پہلے کی میڈیکل رپورٹ میں تھی یعنی نیلما افیون کی عادی ہوگئی ہے اور آج بھی اس کے خون میں افیون کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے بیان دیا تھا۔ یہ ذہنی طور پر بچی ہے، اس کی یادداشت کمزور ہے، کوئی بات یاد نہیں رکھ سکتی۔ یہ اتنی ڈرپوک ہے کہ رات کو دروازے پر دستک سن کر چونک جاتی ہے، شدید گھبراہٹ کا شکار ہونے لگتی ہے۔ جو لڑکی اتنی بزدل ہو اور دستک کی آواز پر چونک جاتی ہو، وہ بھلا سیون ایم ایم جیسی شور مچانے والی رائفل سے اپنے دادا کو کیسے ہلاک کر سکتی ہے۔ بہرحال، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ کسی دوسرے نے اس کے بچگانہ پن کی آڑ لے کر غازی جمال الدین کو قتل کیا تھا اور ایسا وہی کر سکتا تھا جو اس قتل کے بعد مالی منفعت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

علاؤالدین چنگیزی کے لئے ایک بات پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ عدالت نے نیلما کی میڈیکل رپورٹ حاصل کرنے کا حکم دیا تو سرکاری غور پر اس کا معائنہ کرنے اور اس کی میڈیکل رپورٹ تیار کرنے والی رضوانہ تھی۔ وہ تقریباً پچیس برس بعد رضوانہ کو دیکھ کر جھینپ گیا۔ اس سے نظریں چرا کر عدالت کے برآمدے میں آ گیا۔ اسے عاصمہ کا انتظار تھا، وہ نیلما کو ساتھ لانے والی تھی۔ تب پیچھے سے رضوانہ کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے برباد کرنے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نیلما کی میڈیکل رپورٹ پیش کر رہی ہوں۔''

اس نے گھبرا کر اسے دیکھا، پھر پوچھا۔ ''کیا اس کیس میں تم ہی سرکاری ڈاکٹر ہو؟''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی عدالتی کارروائی شروع ہو گی تو میرا تعارف ہو جائے گا۔ بائی دی وے، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ نیلما سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔ ابھی سرکاری وکیل نے تمہاری طرف اشارہ کرتے ہوئے جب یہ بتایا کہ تم نیلما کے پھوپھا ہو تو ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیسی باتیں سمجھ میں آ گئیں؟ تم میرے بارے میں کیا

رائے قائم کر رہی ہو۔ دیکھو، کوئی غلط رپورٹ نہ دینا، میں وہ پہلے جیسا چنگیزی نہیں ہوں۔ تمہیں دھوکا دینے کے بعد آج تک پچھتا رہا ہوں۔ تم یقین نہیں کرو گی، کوئی دن ایسا نہیں گیا، جب میں نے تمہیں یاد نہ کیا ہو۔''

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''اپنی گندی زبان سے میرے لئے محبت کا اظہار نہ کرنا۔ جانتے ہو، میں نے آج تک شادی نہیں کی۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، تمہارے دل میں ابھی تک میرے لئے جگہ ہے۔''

''میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں۔ شادی اس لئے نہیں کی کہ جو میرا شوہر ہوتا، میں اسے دھوکا دیتی۔ اس کے پاس باسی پھول کی خوشبو بن کر جاتی۔ وہ شریف آدمی میری ذات سے دھوکا کھاتا رہتا اور میرا ضمیر مجھے کچوکے دیتا۔ یہ مجھ جیسی عورتوں کی عظمت ہے کہ ایک مرد سے فریب کھانے کے بعد دوسرے سے انتقام نہیں لیتیں لیکن............''

اس نے چنگیزی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''جس سے دھوکا کھاتی ہیں، اسے کبھی معاف نہیں کرتیں۔ میں نے تمہیں معاف نہیں کیا ہے۔ میں ایک کمزور عورت ہوں۔ دن رات تمہیں بددعا دیتی رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، تم سے کس طرح انتقام لیا جائے۔ آج خدا نے موقع دیا ہے۔ اب دیکھو، میں کس طرح اس کیس میں تمہیں الجھاتی ہوں۔''

وہ غصے سے پلٹ کر جانے لگی۔ چنگیزی نے آواز دی۔ ''رضوانہ، رک جاؤ۔ پلیز، میری بات سن لو۔''

وہ اس کے پیچھے خوشامد کرتا ہوا جانے لگا لیکن وہ عدالت کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی اور سرکاری وکیل کے پاس پہنچ کر باتیں کرنے لگی تھی، وہ دور سے پریشان ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے وقت کیا کرنا چاہئے۔ جب سمجھ میں نہیں آتا تو صبر کرنا پڑتا ہے۔ کسی مناسب موقع کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس نے سوچا۔ میں دیکھتا ہوں، یہ آج عدالت میں میرے خلاف کیا کرنے والی ہے، اس کے بعد اپنے بچاؤ کی کوشش کروں گا۔

عدالتی کارروائی کے دوران وکیل نے کہا۔ ''اگرچہ میڈیکل رپورٹ ملزمہ نیلما کو معصوم اور بے گناہ ثابت کرتی ہے، تاہم یہ کسی نہ کسی پہلو سے اس واردات میں ملوث ضرور ہے۔''

اس نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''مقتول جمال الدین ایک کروڑ پتی بزنس

مین تھا۔ ان کی تمام دولت اور جائیداد ہتھیانے کے لئے انہیں ایسے افراد قتل کر سکتے ہیں جنہیں ان کی موت سے فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہو۔ اگرچہ ملزمہ نیلما ایک بے ضرر لڑکی ہے۔ ایسی بے ضرر لڑکیوں کو قاتل اپنا آلہ کار بنا سکتا ہے۔ میڈیکل رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اسے کھانے پینے کی چیز میں افیون ملا کر دی جاتی ہے۔ میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ نیلما کو چند ماہ کے لئے اس کے گھر سے اس کے رشتے داروں سے دور رکھ کر باقاعدہ علاج کرایا جائے۔ عالی جناب! میں اس سلسلے میں بیگم عاصمہ چنگیزی سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔''

عاصمہ کو کٹہرے میں آنے کے لئے کہا گیا۔ وکیل نے پوچھا۔ ''کیا تم نے نیلما کو بچپن میں دودھ پلایا ہے؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، پلایا ہے۔''

''کیا اسے دودھ میں افیون ملا کر دی جاتی تھی؟''

''میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ ہم تعلیم یافتہ مہذب لوگ ہیں، بچوں کو افیون دے کر سلانا ان کی دماغی صحت مندی کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ میں نے نیلما کو ایک ماں کی حیثیت سے پالا، پوسا اور جوان کیا ہے۔ میں اس سے کبھی دشمنی نہیں کر سکتی۔''

''اگر تم اسے دودھ نہ پلاتیں تو اپنی بہو بنا کر اپنے باپ کی تمام دولت اپنے گھر میں رکھ سکتی تھیں، جبکہ نیلما، زبیر سے منسوب ہو کر اپنے باپ اور دادا کی جائیداد کا بہت بڑا حصہ باہر لے جائے گی۔''

وہ ذرا اگڑ بڑائی، پھر تن کر بولی۔ ''میں لالچی نہیں ہوں۔ میرے باپ نے میرے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے مگر ہاں، میں نیلما کو آج بھی اپنی بہو بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔''

وکیل نے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا تم اپنے ہوش و حواس میں رہ کر ایسا کہہ رہی ہو جبکہ تم نے نیلما کو اپنا دودھ پلایا ہے۔''

عاصمہ نے عدالت میں بیٹھے ہوئے چنگیزی کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ اپنا دودھ پلایا ہے۔ وہ پیدائش کے بعد ہی سے میری گود میں پرورش پاتی رہی ہے اور میں اسے اوپری دودھ پلاتی رہی ہوں۔''

اسے اپنی جگہ جا کر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ پھر نیلما کو بلا کر وکیل نے پوچھا۔ ''کیا آج

بھی دودھ پیتی ہو؟''

''جی ہاں، پیتی ہوں۔''

''کس طرح پیتی ہو؟''

''فیڈر سے۔''

عدالت کی کارروائی دیکھنے اور سننے والے حاضرین بے اختیار ہنسنے لگے۔ ایک بھرپور جوان دوشیزہ فیڈر سے دودھ پینے کی بات کر رہی تھی۔ وکیل نے پوچھا۔ ''تمہیں دودھ کتنا اچھا لگتا ہے؟''

وہ بولی۔ ''بہت اچھا لگتا ہے۔''

''یہ بتانے کی کوشش کرو، کتنا اچھا لگتا ہے؟''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ دور بیٹھی ہوئی عاصمہ کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ''اتنا اچھا لگتا ہے کہ میں کھانا کھانا نہیں چاہتی۔ صرف دودھ پینا چاہتی ہوں مگر آنٹی کہتی ہیں، جب تک کھانا نہیں کھاؤں گی، وہ دودھ نہیں پلائیں گی۔''

عاصمہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ وکیل نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری آنٹی عاصمہ تمہیں دودھ پلاتی ہیں؟''

نیلما نے بے اختیار ہاں کہا۔ پھر جلدی سے عاصمہ کی طرف دیکھا۔ عاصمہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی، وہ فوراً ہی بات بدل کر بولی۔ ''میں آنٹی کا دودھ ضرور پیتی ہوں مگر فیڈر سے پیتی ہوں۔''

اگر رضوانہ اس وقت عدالت میں موجود ہوتی تو شاید اس بات کی تہہ تک پہنچ جاتی۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ نیلما کو کند ذہن اور بچگانہ ذہن رکھنے والی لڑکی سمجھ رہے تھے اور اس کی بے تکی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ وکیل صفائی نے کہا۔ ''جناب عالی! ملزمہ نیلما پر قتل کا الزام ثابت نہیں ہو سکا تو ہمارے فاضل وکیل اب دودھ کا جھگڑا لے بیٹھے ہیں۔''

سرکاری وکیل نے کہا۔ ''جناب عالی! میڈیکل رپورٹ سے ثابت ہو چکا ہے کہ نیلما کو افیون دی جاتی ہے اور نیلما کے بیان سے ثابت ہو رہا ہے، افیون دودھ میں گھول کر دی جاتی ہے۔ وہ دودھ اس قدر ذائقے دار ہوتا ہے کہ یہ اس کے مقابلے میں کھانا پینا چھوڑ سکتی ہے مگر دودھ نہیں چھوڑ سکتی۔''

رضوانہ مجھ سے منسوب ہونا چاہتی تھی۔ مجھ پر مرمٹی تھی لیکن مجھے قطعی پسند نہیں تھی۔ میں نے تم سے شادی کرلی۔ اب اس کا نتیجہ سامنے آرہا ہے۔ وہ مجھے بے وفا سمجھتی ہے اور مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہے۔"

"بے وفائی کی بات رہنے دو۔ ابھی معاملہ دوسرا ہے۔ ایک تو رضوانہ میرے ذاتی راز کو سمجھتی ہے۔ دوسرے نیلما اس کے زیرِ علاج رہے گی۔ دودھ پینے کا وقت ہوگا تو وہ پاگل کی بچی میرے ہی سینے سے لگ کر دودھ پینے کے لئے مچلے گی۔ اس وقت کیا ہوگا؟"

"عاصمہ! تم نے بڑی غلطی کی۔ جب وہ بچی تھی، اسی وقت اسے اپنے سینے سے الگ کرتیں اور فیڈر سے دودھ پینے کی عادت ڈالتیں لیکن وہ ضد کرتی تھی، اس کے دادا جان تمہیں ڈانٹتے تھے اور تم اسے کمرے میں لے جاکر سینے سے لگا لیتی تھیں۔"

وہ پریشان ہوکر بولی۔ "میں سمجھتی تھی، یہ راز ہی رہے گا۔ وہ تو نادان ہے۔ بالکل ہی احمق ہے۔ دودھ پینے کے لالچ میں کبھی راز فاش نہیں کرے گی۔ اس لئے مصنوعی خول میں دودھ بھر کر اسے پلایا کرتی تھی۔ اسی لئے اسے فیڈر کی عادت نہیں پڑسکی۔"

"تم نے اپنی عقل سے کام لیا مگر تقدیر اپنا کام دکھا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کیا جائے؟"

وہ پریشان ہوکر بولی۔ "میں یہی سنتی آئی تھی کہ ایک جھوٹ کے بعد آدمی جھوٹ بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسے وہ پہلا جھوٹ مجبور کرتا رہتا ہے۔ آج پتا چلا، ایک قتل کرنے کے بعد دوسرا، تیسرا قتل کرنے پر حالات مجبور کرنے لگتے ہیں۔"

چنگیزی نے گھبرا کر دروازے، کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ پھر قریب آکر کہا۔ "تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ آہستہ بولو، دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"میں اپنے سینے کا راز ظاہر نہیں ہونے دوں گی، آج تک چھپا کر رکھا ہے اور مرتے دم تک چھپاتی رہوں گی۔ تم نے دولت کی خاطر میرے ڈیڈ کو ختم کیا ہے تو پلیز، رضوانہ کو بھی ٹھکانے لگادو۔"

وہ ایکدم سے قریب آکر بیٹھ گیا۔ کان کے پاس منہ لے جاکر سرگوشی میں کہنے لگا۔ "تم اسے کھیل سمجھتی ہو؟"

"جو لوگ دولت سے کھیلنا چاہتے ہیں، ان کے سامنے بڑے سے بڑا مسئلہ بھی کھیل

بن جاتا ہے۔ تم اس معاملے پر غور کرو۔ تمہیں جلد ہی یقین ہوجائے گا کہ رضوانہ ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔"

"یہ خطرہ میں نے اسی وقت محسوس کرلیا تھا، جب اس نے عدالت کے کمرے میں مجھے چیلنج کیا تھا۔"

"پھر کچھ کرو۔"

وہ عاصمہ سے دور جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنی بیوی کو دور ہی سے دیکھنے لگا۔ وہ سامنے جو بیوی تھی، اب پچیس برس پرانی ہوگئی تھی اور جو پچیس برس پرانی رضوانہ تھی، اب نئی لگ رہی تھی۔ پھر رضوانہ وہ زہریلی ناگن کیسے نظر نہ آتی جو خطرناک ہوتی ہے، ڈس سکتی ہے لیکن سپیرے کو منتر معلوم ہو تو اپنے بس میں بھی ہوسکتی ہے۔

ایسے موقع پر اپنی بیوی کباڑیے کی دکان میں رکھے ہوئے زنگ آلود سامان کی طرح نظر آتی ہے، خواہ اس بیوی سے کروڑوں روپے حاصل ہو رہے ہوں۔ نوٹ چھاپنے والی مشین جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے لیکن بیڈروم میں اچھی نہیں لگتی۔ رضوانہ میں سب سے زیادہ کشش اس بات کی بھی تھی کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔

عاصمہ نے پوچھا۔ "یوں میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

اس نے بیوی کو عاشقانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب تمہیں دیکھتا ہوں تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں اور تمہارے لئے سوچتا ہوں تو سوچتا ہی رہ جاتا ہوں۔ اب سوچ رہا ہوں، تمہارے لئے پھر ایک بار جان کی بازی لگاؤں گا۔ میں پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاؤں تو کوئی بات نہیں مگر اس کمینی رضوانہ کو اغوا کروں گا۔"

وہ خوش ہو رہی تھی لیکن اغوا کی بات پر چونک کر بولی۔ "کیا تم اسے اٹھا کر لے جاؤ گے؟"

"یہی ایک راستہ ہے۔ میں چند غنڈوں سے کام لوں گا، وہ اسے لے جائیں گے اور اس کی عزت کی دھجیاں اڑاتے رہیں گے۔ اس کے بعد وہ شرم سے اور اپنی عزت کے خیال سے کچھ کہہ نہیں سکے گی۔ کہنا بھی چاہے گی تو ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہ ہوگا۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے، وہ اور زیادہ دشمنی پر اتر آئے۔"

چنگیزی اس معاملے میں بیوی سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ہر حال میں رضوانہ کو

کہیں لے جا کر اپنی راتیں رنگین کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بظاہر تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ اسے غنڈوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے گا۔''

☆======☆======☆

رضوانہ دماغی مریضوں کو اٹینڈ کرنے کے بعد چیمبر میں داخل ہوئی۔ وہاں زبیر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ہیلو ڈاکٹر! اگر آپ نے مجھے نہیں بھلایا ہے تو میں وہی زبیر ہوں جس نے کل عدالت میں آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔''

''بیٹھ جائیے۔''

وہ بیٹھ گیا۔ رضوانہ دو نرسوں کو بلا کر مریضوں کے متعلق ضروری ہدایات دینے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہاں زبیر! کیا آپ نیلما کے متعلق مفید معلومات فراہم کر سکتے ہیں؟''

''آپ یہ بتائیں، نیلما کو کب تک ہسپتال میں لایا جائے گا؟''

''پولیس والے اس سلسلے میں کاغذات تیار کر رہے ہیں۔ شاید کل یا پرسوں تک وہ یہاں آ جائے گی۔''

''ڈاکٹر! وہ جب سے پیدا ہوئی ہے، کبھی تنہا نہیں رہی۔''

''کیا وہ عاصمہ کے ساتھ سوتی ہے؟''

''اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سب عاصمہ آنٹی کے ساتھ ہے۔''

''رات کو کس کمرے میں سوتی ہے؟''

''اپنے ہی کمرے میں لیکن جب تک آنٹی آ کر اسے سلاتی نہیں ہیں، وہ بے خوابی کی شکایت کرتی رہتی ہے۔''

''وہ تمہاری منکوحہ ہے۔ تم اسے اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتے؟''

''دادا جان کہا کرتے تھے۔ جب یہ دماغی طور پر نارمل ہو جائے، گھر گرہستی کو سمجھنے لگے تو دلہن بنا کر میرے ساتھ رخصت کر دیں گے۔''

''کیا تمہارے دادا جان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ لڑکی دلہن بن کر اپنے میاں کے پاس جاتی ہے تو پھر بالکل ہی نادان نہیں رہتی۔ اس میں قدرتی طور پر کچھ سمجھ بوجھ آ جاتی ہے۔ وہ دنیا کو سمجھے یا نہ سمجھے، اپنے مرد کو سمجھنے لگتی ہے۔ اسے چاہنے لگتی ہے۔ اس کے متعلق

سوچنے لگتی ہے اور جب کسی کو اپنی سوچ کا مرکز بنا لیتی ہے تو پھر اتنی ناسمجھ نہیں رہتی جتنی کہ نیلما ہے۔''

زبیر نے کہا۔ ''آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ میں حیران ہوں، خود ایسی بات کیوں سمجھ نہ سکا۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''شاید اس لئے کہ عاصمہ کی لڑکی نادرہ کشش رکھتی ہے۔''

اس نے سر کو جھکا لیا، پھر کہا۔ ''نیلما بہت حسین ہے لیکن صرف حسن سے کام نہیں چلتا۔ میں ہمیشہ یہ سوچ کر الجھتا رہا ہوں کہ بچگانہ ذہن رکھنے والی لڑکی کے ساتھ ازدواجی زندگی کیسے گزاروں گا، کس طرح وہ میرا گھر سنبھالے گی اور کس طرح میں اسے سوسائٹی میں لے جا سکوں گا۔ سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نادرہ کی طرف مائل ہوتا گیا۔''

''میں عاصمہ اور چنگیزی کو اچھی طرح جانتی ہوں بلکہ پہچانتی ہوں۔ انہوں نے تمہیں نادرہ کی طرف جھکا دیا ہے۔ تاکہ نیلما ان کی بہو بن سکے۔ یہ بیان عاصمہ عدالت میں دے چکی ہے۔''

''جو باتیں آپ کہہ رہی ہیں، انہیں میں ایک عرصے سے سمجھتا آ رہا ہوں۔ آنٹی عاصمہ اور انکل چنگیزی مجھے سازشی لگتے ہیں۔''

رضوانہ نے پوچھا۔ ''نادرہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے؟''

''نادرہ کچھ دنوں سے بہت ضد کرنے لگی ہے کہ میں نیلما کو طلاق دے کر اس سے شادی کر لوں۔''

''اور تم نادرہ کے ساتھ اس حد تک آگے بڑھ چکے ہو کہ شادی پر مجبور ہو جاؤ گے اور نیلما کو طلاق دے دو گے۔ اس بدنصیب کو پھر ان سازشی رشتے داروں کے جنگل میں چھوڑ دو گے جو صرف دولت سمیٹنے کی خاطر اسے قبول کریں گے، جب سب کچھ اپنا ہو جائے گا تو افیون دینے والے اسے زہر دے دیں گے۔''

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''آپ آنٹی عاصمہ اور انکل چنگیزی کو کب سے جانتی ہیں؟''

''جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے تب سے۔''

''کیا آپ کا تعلق کسی طرح ہمارے خاندان سے ہے؟''

''چنگیزی دور کے رشتے سے میرا کزن تھا، میری اس سے شادی ہونے والی تھی۔ آج تم اور نادرہ جس مرحلے پر ہو، میری اور چنگیزی کی محبت بھی اسی مرحلے پر تھی، اچانک اس نے ایک زبردست چال چلی۔ عاصمہ کو پھانس لیا اور اس سے شادی کر لی۔''

''اور آپ؟''

''میں تنہا تھی، تنہا ہوں اور تنہا رہوں گی۔''

''یعنی آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟''

''کیا مجھے شادی کرنا چاہئے؟ جو میرا جیون ساتھی بن کر آئے اور مجھے اپنی عزت بنائے، مجھے اس سماج میں مان مرتبہ دے اور میری حیثیت بلند کرے، کیا اسے دھوکا دینا چاہئے؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ ایک عظیم عورت ہیں لیکن میں مردوں کی طرف سے یہ ضرور کہوں گا کہ سب ہی اتنے تنگ نظر اور تنگ دل نہیں ہوتے جتنا آپ نے سمجھ لیا ہے۔ اکثر لوگ اس قدر فراخ دل ہوتے ہیں کہ اپنی عورت کو ماضی کی غلطیوں سمیت قبول کر لیتے ہیں۔ پھر اسے کسی طرح بھی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونے دیتے۔''

''تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے، تم نادرہ کو اس کی غلطیوں سمیت نکاح میں قبول کرو گے؟''

''میں اسے دھوکا نہیں دوں گا۔''

''پھر نیلما کا کیا ہوگا؟''

''یہی سوچ کر الجھ جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں، کوئی اچھا لڑکا ملے.........''

''دیکھو خود کو فریب نہ دو۔ کیا نیلما کے لئے تم اچھے نہیں ہو۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ عاصمہ کا بیٹا اسے خوش رکھ سکے گا، اسے ایک شوہر کی بھرپور محبت دے گا یا اسے نوٹ چھاپنے والی مشین سمجھتا رہے گا۔''

''آپ درست کہتی ہیں، میں خود کو فریب دے رہا ہوں کہ نیلما کو کوئی اچھا شوہر مل جائے گا۔ جبکہ یہ ممکن نہیں ہے، اس کے آس پاس سبھی لالچی اور خود غرض لوگ ہیں۔''

''ایسی صورت میں تم پر لازم ہے بلکہ تمہارا فرض ہے کہ تم اس معصوم لڑکی کو اپناؤ اور اسے دشمنوں کے چنگل سے نکال لاؤ۔''

''لیکن نادرہ کا کیا ہوگا؟''

''اس سے صاف صاف کہہ دو کہ شادی نہیں کرو گے۔ نیلما تمہاری منکوحہ ہے، اسی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارو گے۔ اگر نادرہ واقعی تم سے محبت کرتی ہوگی اور تمہارے ہوا کسی اور کا سایہ برداشت نہ کرنا چاہتی ہو تو وہ تمہارے نام پر بیٹھی رہے گی ورنہ کسی سے بھی شادی کر لے گی اور ایک پارسا بیوی بن کر اپنے شوہر کو دھوکا دیتی رہے گی، جو عورت اپنے شوہر کو دھوکا دے سکتی ہے وہ تمہیں بھی دے سکتی ہے اور جو اپنے محبوب کو دھوکا دے سکتی ہے وہ اپنے شوہر سے بھی وفا نہیں کر سکتی۔''

''آپ چاہتی ہیں، میں نادرہ کو چھوڑ دوں؟''

''کسی کو آزمانے کی گھڑی آئے تو آزما کر دیکھ لینا چاہئے۔ اگر وہ تم سے وفا کرتی رہی اور تمہارے سوا کسی کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تب اسے اپنا لینا۔''

''آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟ ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ میں نیلما کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاروں؟''

''کیا تم بعد میں نادرہ سے شادی نہیں کر سکتے؟''

''یعنی دو شادیاں؟ دو بیویاں؟''

''اتنی حیرانی سے کیوں پوچھ رہے ہو جبکہ اپنی منکوحہ کی موجودگی میں نادرہ سے تعلقات قائم کرتے رہے، اس وقت تمہیں اپنے آپ پر حیرانی نہیں ہوئی؟''

''آپ سچ سچ بتائیں، کیا اس لئے ایسا کہہ رہی ہیں کہ نادرہ، انکل چنگیزی کی بیٹی ہے اور آپ کو انکل سے بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ آپ شاید انتقام لینا چاہتی ہیں؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی کرسی کی پشت سے ٹک گئی، پھر بولی۔ ''میں عورت ہوں، کسی دوسری عورت کی توہین نہیں کر سکتی۔ اگر نادرہ تمہاری محبت میں ثابت قدم ہوئی تو میں اسے بیٹی بنا کر اس کا نکاح تم سے پڑھاؤں گی، اگر وہ اپنے ماں باپ کی طرح فراڈ ثابت ہوئی تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''ابھی ہم نیلما کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ میں

ہرگز نہیں چاہوں گی کہ تم اس معصوم لڑکی کو دھوکا دو اور اس کی آئندہ زندگی برباد کردو۔ اگر ایسا کرو گے تو پھر اس کا علاج کرنا فضول ہے۔ میں کیوں اسے یہاں لا کر اپنا وقت ضائع کروں جبکہ اسے کوئی اچھا جیون ساتھی بھی نہ مل سکے۔''

''ڈاکٹر میں نے اتنی دیر کی گفتگو میں آپ کو سمجھ لیا ہے۔ جس نے آپ پر ظلم کیا، آپ اس کی بیٹی سے کبھی انتقام نہیں لیں گی۔ آپ میری اور نیلما کی بھلائی کے لئے مجھے سمجھا رہی ہیں۔ چونکہ آپ نیلما کے لئے اچھے اور سچے جذبات رکھتی ہیں، اس لئے میں خود کو آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔''

اس نے جیب سے ایک شناختی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ رضوانہ نے اسے لے کر دیکھا۔ زبیر کی تصویر کے ساتھ جو کچھ لکھا ہوا تھا، اسے پڑھ کر حیرانی سے بولی۔ ''اوہ مائی گاڈ! آپ انٹیلی جنس کے افسر ہیں؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے آپ نہیں، تم کہیں۔ آپ میری بزرگ ہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے، اس کے شناختی کارڈ کو واپس کرتے ہوئے بولی۔ ''اب نیلما کے علاج میں آسانی رہے گی۔''

''کیا میں آپ کو بزرگ سمجھ کر جو کہوں گا، اس پر یقین کریں گی۔''

''تم اچھے اور سچے لگتے ہو۔ ضرور یقین کروں گی۔''

''میں نادرہ کے ساتھ بڑی حد تک بے تکلف رہا ہوں لیکن ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس سے بعد میں شرمندہ ہونا پڑے۔ میں انکل چنگیزی کی طرح کسی عورت کو کھلونا بنا کر خوش ہونا نہیں جانتا۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے۔ اللہ تمہیں زیادہ سے زیادہ نیک ہدایات دے۔ انشاء اللہ ہم دونوں اپنی کوششوں سے نیلما کو دماغی طور پر نارمل بنائیں گے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ''مجھے اجازت دیجئے، اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے، پھر حاضر ہو جاؤں گا۔''

وہ سلام کر کے جانا چاہتا تھا، رضوانہ نے کہا۔ ''تمہاری باتیں سننے اور تمہارا شناختی کارڈ دیکھنے کے بعد میں تم پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگی ہوں۔ یہاں نیلما کے پاس کوئی

نہیں آ سکے گا لیکن تم شوہر کی حیثیت سے آؤ گے اور میرے اس ہسپتال کے پرائیویٹ کوارٹر میں اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارو گے۔''

''شکریہ ڈاکٹر، آپ نیلما کے لئے جو بھی نسخہ تجویز کریں گی، میں اس پر عمل کروں گا۔''

وہ رضوانہ سے رخصت ہو کر انٹیلی جنس بیورو کی عمارت میں آیا۔ پھر اپنے دفتر میں پہنچ کر آرام سے بیٹھ کر ریسیور اٹھاتے ہوئے نمبر ڈائل کئے۔ تھوڑی دیر بعد اسے نادرہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے زبیر کی آواز پہچانتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟ میں انتظار کر رہی ہوں۔''

''میں آئی بی کے دفتر میں ہوں، پھر سے سراغ رساں بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''تم زندگی بھر سراغرساں نہیں بن سکو گے، بس میرے شوہر بن سکتے ہو۔ یہاں فوراً آ جاؤ، میری ممی اور ڈیڈی ہمارے رشتے کو منظور کرنے والے ہیں۔''

''لیکن میں کیسے منظور کر سکتا ہوں جبکہ بچپن ہی سے میری ایک بیوی موجود ہے۔''

''وہ بچپن کا نکاح تھا۔''

''لیکن جوانی میں تصدیقی دستخط کرائے گئے تھے۔ میں نے پورے ہوش و حواس میں نیلما کو اپنی منکوحہ، اپنی شریکِ حیات تسلیم کیا ہے۔''

''زبیر، یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں تم پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں اور تم ہو کہ اس پاگل لڑکی کو شریکِ حیات تسلیم کر رہے ہو۔''

''سچ بات تو یہ ہے کہ تم نے مجھے پھانسنے کے سلسلے میں انتہائی کوششیں کیں لیکن میں نے تمہیں انتہا تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا تاکہ کسی بھی مرحلے پر میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کرے۔''

''آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''وہی کہہ رہا ہوں جسے سننے کی توقع نہ تم کر سکتی تھیں نہ تمہارے ممی اور ڈیڈی۔ میں پھر ایک بار ٹریننگ کے سلسلے میں کچھ عرصے کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ اس دوران اپنا گھر بسا لو تو بہتر ہوگا۔ اپنے بھائی اور بھاوج کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے میرے پیچھے پڑو گی تو ہمیشہ مایوسی اور ناکامی ہو گی۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو۔ تمہاری خاطر میں نے پولیس والوں کو ایسا بیان دیا جس سے کنواری لڑکی بدنام ہو جاتی ہے۔ میں عدالت میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ

صرف تمہیں چاہا ہے اور تمہارے ساتھ ایسے مرحلوں سے گزر چکی ہوں جن کے بعد عورت کسی دوسرے مرد کا تصور نہیں کرتی اور نہ ہی کروں گی۔"

میں قانون کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے اتنے نادان نہیں ہوتے کہ ایک جذباتی لڑکی کے بیان پر یقین کر کے مجھے تم سے شادی کرنے پر مجبور کر دیں۔ تم اگر قانون نہیں جانتی ہو تو اسے پڑھ کر سمجھو، کسی وکیل سے مشورے کر لو۔ پھر میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی۔ وِش یو گُڈ لک اینڈ وِش یو اے گُڈ لائف پارٹنر ایکسیپٹ می، دیٹس آل۔"

وہ ریسیور رکھنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سے نادرہ نے چیخ کر کہا۔ "ٹھہرو، خبردار دیکھو، ریسیور نہ رکھنا۔ ذرا ایک منٹ ہولڈ کرو۔"

اس نے ہولڈ کیا۔ دوسری طرف سے نادرہ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اپنی ممی عاصمہ سے کہہ رہی تھی۔ "وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ نیلما کو طلاق دینا نہیں چاہتا۔ مجھ سے کہہ رہا ہے، میں کوئی دوسرا لائف پارٹنر تلاش کر لوں۔ ممی، یہ کیا ہو رہا ہے، آپ لوگوں کے کہنے پر میں نے اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارا ہے، وہ کمبخت میرے دل اور دماغ پر چھا گیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟"

"بیٹی، جو عورتیں دل کی باتوں میں آتی ہیں، وہ ہمیشہ دھوکے کھاتی ہیں۔ ہمیشہ احساسِ کمتری میں مبتلا رہتی ہیں، ہمیشہ ذلت کی زندگی گزارتی ہیں۔ میں پچیس برس سے تمہارے ڈیڈ کے ساتھ ہوں لیکن آج مجھے معلوم ہو جائے کہ ان کے ساتھ رہنے میں میری انسلٹ ہے تو میں انہیں ایک ٹھوکر میں الگ کر دوں گی۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، لہٰذا محبت اور جذبات کو ایک طرف رکھو۔ یہ صرف احمق بنانے والی باتیں ہیں۔ زبیر سے کہو، وہ تم سے ایک ملاقات کرے تنہائی میں، صرف ایک بار۔"

"ممی! اس سے کیا ہوگا؟"

"تم اس سے کہو تو سہی۔ اس سے ایک ڈیٹ لے لو۔ پھر میں تمہیں چال سمجھاؤں گی۔"

اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ "ہیلو زبیر، ہیلو۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"میں تم سے ایک بار ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک رات کے لئے ہوٹل رین بسیرا میں ملاقات کرو۔ میں ایک کمرا ریزرو کراتی ہوں، وہاں ہم اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کریں گے، اگر ایک دوسرے سے متفق ہوئے تو اچھی بات ہے ورنہ الگ راستہ اختیار کر لیں گے۔"

"وہاں تمہارے پاس اور کون ہے؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی ماں کو دیکھا، پھر کہا۔ "کوئی نہیں ہے، میرے پاس کوئی نہیں ہے۔ میں تنہا ہوں، ورنہ تم سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ کیسے باتیں کرتی۔"

"تم تو ہر لمحہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی ہو لیکن میں ہی تمہیں قابو میں رکھتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ایک رات ہوٹل میں وقت گزارنے کا مطلب ہے کہ رات کی سیاہی کی طرح اپنا منہ کالا کر لوں اور تم جانتی ہو، میں اتنا کمزور آدمی نہیں ہوں۔ تم مجھ سے کوئی اہم گفتگو کرنا چاہتی ہو تو آج شام ہل پارک میں ملاقات کرو۔ ہمارے آس پاس ساری دنیا ہوگی، ہم وہیں ایک جگہ بیٹھ کر گفتگو کریں گے تو کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔ ہم وہیں بیٹھ کر فیصلہ کر لیں گے ویسے میں فیصلہ سنا چکا ہوں۔ تم خواہ مخواہ اپنی سی کوششیں کر رہی ہو اور میں جانتا ہوں، تم ملاقات کرو گی تو صرف تنہائی میں .... یقین نہیں ہے تو وہاں تمہارے ممی اور ڈیڈی بیٹھے ہوں گے، ان سے پوچھ لو۔ دیٹس آل۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ ہیلو ہیلو، کہتی رہی۔ پھر ریسیور پٹخ کر بولی۔ "میں آپ لوگوں کے کہنے پر اس کمبخت کو اتنی لفٹ دیتی رہی۔ اس کے لئے انسپکٹر کو پانچ ہزار روپے رشوت کے طور پر دیئے۔ آپ لوگوں کے کہنے پر آئندہ یہ بیان دے سکتی تھی کہ اس کے ساتھ تنہائی میں .... وقت گزار چکی ہوں لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ نہ اس کمبخت نے مجھے اتنی لفٹ دی اور نہ ہی میں اس حد تک بدنام ہونا چاہتی ہوں۔ ممی آپ لوگوں کی سازشیں، آپ لوگوں کے منصوبے بالکل ناکام ہو رہے ہیں۔"

عاصمہ اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی، پھر اس نے کہا۔ "زبیر بہت چالاک ہو سکتا ہے لیکن تمہارے ڈیڈی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ وہ ہم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ بہت جلد زبیر کو اس طرح اُلو بنائیں گے کہ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر صرف تمہیں دیکھے گا۔ اسے تمہارے سوا کوئی لڑکی نظر نہیں آئے گی۔"

اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ دونوں ماں بیٹی وہاں سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کے پاس آئیں۔ اسے کھول کر دیکھا۔ ایک سپاہی کھڑا ہوا تھا، اس نے ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے لیجئے اور دستخط کیجئے۔'' اس نے ایک پیون بک آگے بڑھائی۔ عاصمہ نے اس پر دستخط کئے، سپاہی چلا گیا۔ پھر اس نے لفافہ چاک کر کے اندر کا مضمون پڑھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا۔ عدالت عالیہ کے حکم کے مطابق کل دس بجے ایک پولیس آفیسر یہاں آئے گا اور نیلما کو دماغی مریضوں کے ہسپتال میں لے جائے گا۔ لہٰذا اس کے کپڑے لتے اور دوسری ضروریات کا سامان تیار رکھا جائے تاکہ بیگم نیلما زبیر کی منتقلی آسان ہو سکے۔

یہ پڑھنے کے بعد نادرہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''دیکھئے ممی، اپنی آنکھوں سے دیکھئے، اس نوٹس میں بیگم نیلما زبیر لکھا ہے، یعنی زبیر کا میری زندگی سے، میرے جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

عاصمہ نے غصے سے نوٹس کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر کہا۔ ''میں ہمیشہ سے سمجھاتی آ رہی ہوں، کبھی جذبات کو غالب نہ آنے دو۔ نیلما تمہارے بھائی جان کی شریکِ حیات اور تم زبیر کی شریکِ حیات بنو گی۔ تمہارے نانا جان غازی جمال الدین مرحوم کی تمام دولت اور جائیداد صرف تمہارے بھائی بہن کے حصے میں آئے گی۔ بس اس بات کو یاد رکھو اور جذبات کو کچل ڈالو۔''

نادرہ نے کہا۔ ''جذبات کی ایسی کی تیسی۔ میں نے کب زبیر کو ایک محبوب کی طرح چاہا ہے۔ میں تو آپ لوگوں کے فیصلے پر عمل کرتی رہی۔ آج بھی عمل کرنے کو تیار ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا، اس کا نتیجہ کبھی اچھا نکلے گا۔''

''نتیجہ اپنے بزرگوں پر چھوڑ دو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے زبیر کیا چیز ہے۔''

عاصمہ نے یہ کہہ کر خلا میں تکنا شروع کیا۔ وہ سوچ رہی تھی اور تصور میں زبیر اور اپنے شوہر چنگیزی کو دیکھ رہی تھی۔ زبیر پچیس برس کا جوان تھا جبکہ چنگیزی اپنی عمر کی آدھی صدی گزار چکا تھا۔ پچاس برس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ اس نے جب بھی کوئی چال چلی تو ناکام نہیں ہوا، جبکہ زبیر ناکام ہوتا رہا۔ ایک ناکام سراغرساں۔

زندگی میں کامیاب اور کامران رہنے کے لئے رازداری شرط ہوتی ہے۔ انسان جتنا کم بولے گا، جتنا کم لوگوں سے ملے گا اور کم لوگوں سے ملنے کے باوجود زیادہ سے زیادہ

معلومات حاصل کرے گا اور اپنی ذات کو ایک راز بنا کر رکھے گا، اس وقت تک وہ کامیاب ہوتا چلا جائے گا۔ عاصمہ اور چنگیزی یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے معاملات میں کس قدر کامیاب ہے۔

دوسرے دن پولیس والے عدالت سے جاری کردہ حکم نامہ لے کر آئے، نیلما ان کے ساتھ جانے سے انکار کرنے لگی۔ عاصمہ اور چنگیزی کو ساتھ جانے کی اجازت نہیں تھی۔ زبیر نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ وہاں تمہارا علاج ہو گا۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

وہ زبیر سے بڑی حد تک مانوس تھی۔ اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی۔ عاصمہ، نادرہ، چنگیزی اور ارباب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دولت حاصل کرنے کا اتنا بڑا ذریعہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ویسے چنگیزی ہولے ہولے عاصمہ کے شانے کو تھپک رہا تھا۔ اشارے کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ''فکر نہ کرو۔ میں رضوانہ کی زبان کھلنے نہیں دوں گا۔''

وہ پولیس والوں کے ساتھ ہسپتال پہنچی۔ زبیر اس کے ساتھ تھا۔ ہسپتال کے پچھلے حصے میں چھوٹے چھوٹے دو کمروں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے، وہاں ایسی عورتوں کو رکھا جاتا تھا جو دماغی طور پر نارمل نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی زیادہ خطرناک ہوتی تھیں، جن کے متعلق یقین ہو جاتا تھا کہ دو چار ماہ کی مسلسل توجہ اور علاج کے بعد نارمل ہو جائیں گی۔ زبیر، نیلما کو لے کر ایسے ہی ایک کوارٹر میں آیا۔ کوارٹر کے چاروں طرف ایک چار دیواری تھی۔ ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ طرح طرح کے رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ کمروں میں جو ڈسٹمپر تھا وہ ہلکے رنگ کا تھا۔ ہوادار کھڑکیوں اور دروازوں پر خوب صورت پردے لگے ہوئے تھے۔ پردوں، تصویروں اور پھولوں کے سلسلے میں مناسب رنگوں کا انتخاب کیا گیا تھا تاکہ رنگوں کے ذریعے بھی مریضہ کا دماغ پُرسکون اور ٹھنڈا رہے۔

نیلما چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی اور پریشان ہو کر کہہ رہی تھی۔ ''میں یہاں نہیں رہوں گی۔''

زبیر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تمہیں کبھی کبھی تنہا رہنے کی عادت ڈالنا چاہئے۔''

''کیا میں بالکل اکیلی رہوں گی؟''

''میں تمہارے پاس آیا کروں گا۔''

''مجھے رات کو ڈر لگے گا۔''

''میں رات کو تمہارے پاس رہوں گا۔''

''مجھے آنٹی کے بغیر نیند نہیں آئے گی۔''

زبیر نے اس کے خوب صورت چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''میں تمہیں آنٹی کے بغیر سونا سکھا دوں گا۔''

اتنے میں رضوانہ آگئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ہیلو نیلما کیسی ہو؟''

وہ اس کا منہ تکنے لگی۔ زبیر نے کہا۔ ''یہ تمہاری ڈاکٹر ہیں۔ ان کو سلام کرو۔''

اس نے سلام کیا۔ رضوانہ نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ ہم جو کہیں، اس پر عمل کرتی رہو۔ تم کتنی پیاری بچی ہو۔ ہماری بات مانتی رہو گی تو عقل مند بچی بھی کہلاؤ گی۔''

زبیر نے کہا۔ ''نیلما، ڈاکٹر سے پرامس کرو۔ تم ان کی بات مانتی رہو گی، برابر دوائیں کھاتی رہو گی۔''

نیلما نے وعدہ کیا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ، میں آپ کی ہر بات مانتی رہوں گی۔ دوائیں برابر کھاتی رہوں گی مگر آنٹی کو بلا دیجئے۔''

''آج سے پندرہ دن کے بعد آنٹی سے ملاقات ہوگی اور وہ بھی آدھے گھنٹے کے لئے۔''

''میں ان کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتی۔ آپ پندرہ دن کی بات کر رہی ہیں۔''

''تم ان کے بغیر رہنے کی عادی ہو جاؤ گی۔ اب تم نے وعدہ کیا ہے، ہماری ہر بات مانتی رہو گی، لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ پندرہ دن تک تمہیں آنٹی کے بغیر رہنا ہے۔''

''میں نہیں رہ سکتی۔''

''پھر تمہیں بتانا ہوگا کہ ان کے بغیر کیوں نہیں رہ سکتیں؟''

اس نے پریشان ہو کر زبیر کو دیکھا۔ پھر رضوانہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔''

''نہ بتاؤ، ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ تم یہاں سے باہر نکل کر دیکھو، ایک بڑی بڑی مونچھوں والا سپاہی بندوق لے کر کھڑا ہے، جو عورت اپنے کوارٹر سے باہر جاتی ہے، اسے گولی مار دیتا ہے۔''

وہ سہم گئی، پہلے بندوق کے کھیل سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ دادا جان تھوڑی دیر کے لئے مرتے تھے، پھر زندہ ہو جاتے تھے لیکن جس دن ان کی پیشانی میں سوراخ ہوا اور وہاں سے خون بہنے لگا اور اس کے بعد وہ زندہ نہیں ہوئے، تب سے وہ ڈرنے لگی تھی۔ اب پولیس اور چور والا کھیل نہیں کھیلتی تھی۔ اتنے عرصے میں اس نے کھلونا رائفل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

رضوانہ نے کہا۔ ''زبیر! تم نیلما کے پاس رہو۔ تھوڑی دیر بعد میرے پاس آنا۔''

وہ چلی گئی۔ زبیر نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا، پھر نیلما کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتی ہو، نا۔ میں تمہارا دُلہا ہوں۔''

''ہاں، دادا جان کہتے تھے مگر آنٹی کہتی ہیں، ارباب کو میرا دلہا بنائیں گی۔ تم اچھے نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ مجھے بات نہیں کرنا چاہئے مگر تم میرے ساتھ یہاں آگئے۔ آنٹی دیکھیں گی تو ناراض ہو جائیں گی۔''

''ان کی ناراضگی سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟''

''وہ اس لئے کہ.........''

وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ''نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔ میں نہیں ڈرتی ہوں۔ آنٹی بہت اچھی ہیں۔ مجھے اپنے سینے سے لگا کر سلا دیتی ہیں۔''

''کیا تمہیں پتا ہے کہ اپنے دلہا کے سینے سے لگ کر بھی نیند آجاتی ہے؟''

وہ نہیں، کے انداز میں بڑی معصومیت سے سر ہلانے لگی۔ زبیر نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اسے سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب میں تمہارے ہاتھ کو پکڑتا ہوں تو تمہیں کچھ محسوس ہوتا ہے؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ زبیر نے پوچھا۔ ''کیا محسوس ہوتا ہے؟''

''تمہارے ہاتھ سخت ہیں۔''

اس نے ہتھیلی کو بوسہ دیا۔ پھر پوچھا۔ ''تمہیں اچھا لگا؟''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''دادا جان، میری پیشانی کو چومتے تھے۔''

زبیر نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''بزرگ پیشانی کو چومتے ہیں مگر............''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اپنی آنکھوں سے، اپنے ہونٹوں سے اس کو سمجھانے لگا کہ وہ بزرگ نہیں ہے۔ اس کا جیون ساتھی ہے اور جیون ساتھی کی محبت تمام عمر ساتھ چلتی ہے۔ دوسرے تمام رشتے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں مگر محبت کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔

نیلما کا عجب حال تھا۔ اسے زبیر اچھا لگتا تھا مگر پریشان کر رہا تھا۔ اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''تم گندے ہو، تمہاری داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔''

''میں نے دو گھنٹے پہلے شیو کیا تھا۔''

''میں کیا جھوٹ بولتی ہوں؟''

''نہیں، تم سچ کہتی ہو۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ ''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا، آج کے لئے اتنا ہی سبق کافی ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ میرے آنے تک تمہیں جو کچھ بھی محسوس ہوتا رہے، اسے اچھی طرح یاد رکھو۔ ہمیشہ بچی بن کر نہ رہو۔''

وہ دروازہ کھول کر جانے لگا، اس نے کہا۔ ''مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔''

''پھر وہی بچگانہ پن۔ تم بڑی ہو گئی ہو، یہ ہمارا گھر ہے، تم نے دیکھا ہے، جب تمہارے انکل چنگیزی باہر جاتے ہیں تو تمہاری آنٹی ان کا انتظار کرتی ہیں۔ جب واپس آتے ہیں تو وہ کتنا خوش ہوتی ہیں۔''

''ہاں، مجھے اچھا لگتا ہے۔''

''اسی طرح میں جا رہا ہوں۔ تم انتظار کرو، واپس آؤں گا تو خوشی کا اظہار کرنا۔''

وہ چلا گیا۔ پہلی بار نیلما کے دل نے کہا۔ ''اسے نہیں جانا چاہئے۔'' وہ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ وہ دور جا چکا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ''جلدی آؤ گے نا؟''

اس نے ہاتھ کے اشارے سے جلدی آنے کا یقین دلایا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا دربان رائفل لئے کھڑا ہوا تھا۔ نیلما نے جلدی سے دروازے کو بند کر دیا۔ اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی ڈر لگ رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی۔ پھر زبیر کو دور جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

اس کا ایک ہاتھ آپ ہی آپ اپنے چہرے پر بہک رہا تھا۔ ہلکی ہلکی آنچ محسوس ہو رہی تھی حالانکہ وہ تنہا تھی اور جانے والا اب کھڑکی سے بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پردہ برابر کر دیا۔ ڈر بھی لگ رہا تھا، کہیں وہ دربان کھڑکی سے نظر نہ آ جائے۔

دروازے بند تھے۔ گرمی لگ رہی تھی۔ حالانکہ پنکھا چل رہا تھا۔ اس نے پنکھے کی رفتار بڑھا دی۔ اس کے باوجود چہرہ تپ رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر آئینہ دیکھنے لگی۔ تب پتا چلا گورے گورے چہرے پر سرخی جھلک رہی ہے جیسے وہ آتشدان کے سامنے ہو اور شعلے آنچ دے رہے ہوں اور ان کی سرخی چہرے پر جھلک رہی ہو۔

وہ گھبرا کر باتھ روم میں آئی۔ گرمی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے واش بیسن کے نل کو کھولا پھر چلو میں پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔ اس باؤلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج سے اس کا بچپن کروٹ بدل رہا ہے۔

☆======☆======☆

اس دن رضوانہ نے زبیر سے کہا تھا۔ ''میں جو نفسیاتی ٹریٹمنٹ بتاؤں گی، تم اس پر عمل کرو گے اور تم ایک سراغرساں کے نقطۂ نظر سے جو مشورہ مجھے دو گے، میں اس پر عمل کروں گی۔''

زبیر نے کہا۔ ''آپ مجھے اتنا بتا دیں، نیلما کیوں اپنی آنٹی سے متاثر ہے اور کیوں ان کے گن گاتی ہے۔ جب تک وہ نہ ہوں، نیلما ان کے بغیر سو نہیں سکتی۔''

''میں تمہارے سوالوں کا جواب جلد ہی دینے کی کوشش کروں گی۔ اب تم ایک کام کرو گے۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ شریک حیات ہے، اسے شعوری طور پر بیدار رکھنا تمہارا فرض ہے اور تم آج ہی سے یہ فرض ادا کرو گے۔''

''کیا آپ شام کے بعد ہسپتال میں رہیں گی؟''

''میری ڈیوٹی پانچ بجے ختم ہو جاتی ہے لیکن رات آٹھ بجے اسپیشل چیکنگ کے لئے ہسپتال میں آؤں گی اور تم سے ملاقات کروں گی۔'' پھر اس نے نیلما کو انجیکٹ کرنے کے لئے انجکشن کی ایک شیشی دی۔ پھر کہا۔ ''جب وہ بہت زیادہ آنٹی کا مطالبہ کرے۔ ان کے پاس جانا چاہے اور ان کے ہاتھوں سے دودھ پینا چاہے تو اسے انجکشن لگا دینا۔ یہ اسے سلا دے گا۔''

☆======☆======☆

رات کو رضوانہ نے کہا۔ ''زبیر! ابھی تم اس کے پاس نہ جاؤ، پہلے میں اسٹڈی کروں گی۔ دیکھتی ہوں، آج وہ میرے سلانے سے سو سکتی ہے یا نہیں۔''

وہ رات کے آٹھ بجے نیلما کے پاس گئی۔ زبیر کوارٹر کے باہر ایک کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ نیلما نے پوچھا ''زبیر کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی آجائیں گے۔'' رضوانہ نے کہا۔

اس کے لئے کھانا لایا گیا۔

رضوانہ نے کہا۔ ''آج تم میرے ساتھ کھاؤ گی۔ پھر میں تم سے اچھی اچھی باتیں کروں گی۔ تمہیں بستر پر لٹاؤں گی اور تھپک تھپک کر بڑے پیار سے سلا دوں گی۔ تم سو جاؤ گی تو اس کا مطلب ہوگا، اب ننھی سی بچی نہیں رہیں۔ سمجھدار ہوگئی ہو، لہٰذا تمہیں گھر والوں سے ملا دیا جائے گا۔''

وہ خوش ہوکر کھانا کھانے لگی۔ کمرے میں ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ کوئی انگریزی پروگرام چل رہا تھا۔ اسکرین پر ایک بہت ہی خوفناک صورت والا کسی لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا، وہ اسکرین سے نظریں چراتی ہوئی بولی۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

رضوانہ نے کہا۔ ''ادھر مت دیکھو مگر میری یہ بات یاد رکھو کہ یہ ٹی وی ہے، اسکرین پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس ایسی خوفناک صورت والا کوئی نہیں آئے گا۔''

کھانے کے بعد وہ کوارٹر کے پچھلے حصے میں آئیں، وہاں تھوڑی دیر تک ٹہلتی رہیں۔ پھر بیڈروم میں آگئیں۔

رضوانہ نے اسے کچھ گولیاں اور کیپسول کھانے کے لئے دیئے پھر کہا۔ ''آرام سے لیٹ جاؤ۔''

وہ لیٹ گئی لیکن پریشان نظر آرہی تھی۔

رضوانہ نے کہا۔ ''تم آنکھیں بند کرو۔ میں تمہارا سر سہلاتی ہوں ابھی نیند آجائے گی۔''

''نیند نہیں آئے گی، مجھے آنٹی کے پاس لے چلو۔''

''آنٹی کو بھول جاؤ، آج سے میں تمہیں سلایا کروں گی۔''

وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی۔ رضوانہ نے پھر اسے نرمی سے پکڑ کر لٹا دیا اور کہا۔ ''میں جو کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کرو۔ آنکھیں بند کرو۔ ابھی نیند آئے گی۔''

''مجھے نیند نہیں آئے گی، میں دودھ پیوں گی۔''

''یہ پہلے کیوں نہ کہا۔ میں ابھی منگواتی ہوں۔''

وہ بولی۔ ''نہیں، میں گلاس سے دودھ نہیں پیوں گی۔''

''مجھے معلوم ہے، تم فیڈر سے پیتی ہو۔ تم نے عدالت میں یہی بیان دیا تھا۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں مگر میں نے جھوٹ کہا تھا۔''

''کیا جھوٹ کہا تھا؟''

نیلما نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ پھر سختی سے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

رضوانہ نے کہا۔ ''تم کہنا چاہتی ہو مگر چھپانا بھی چاہتی ہو۔ اگر اپنے ڈاکٹر سے سچ نہیں کہو گی تو صحیح علاج نہیں ہو سکے گا اور تم کبھی آنٹی سے نہیں مل سکو گی۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں سچ بتاؤں گی تو کیا آپ آنٹی کو یہاں بلائیں گی؟''

''اگر میں سمجھوں گی کہ علاج کے لئے آنٹی ضروری ہیں تو میں ضرور بلاؤں گی۔''

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہی، رضوانہ کی آنکھوں میں جھانکتی رہی، پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ''مجھے وہ دودھ پلاتی ہیں تو میں سوتی ہوں۔''

''اگر میں پلاؤں تو سو جاؤ گی؟''

''آپ نے پہلے کبھی نہیں پلایا۔ میں کیسے کہہ سکتی ہوں، مجھے نیند آجائے گی۔''

''تم مجھے بتاؤ، آنٹی کس طرح پلاتی ہیں؟''

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولی۔ ''آپ میرے پاس لیٹ جائیں، مجھے اپنے سینے سے لگائیں۔''

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں تمہیں ماں کی بھرپور محبت دوں گی۔ تمہیں اپنے سینے سے لگا کر سلاؤں گی۔''

وہ اس کے پاس لیٹ گئی، اسے اپنے سینے سے لگا لیا لیکن زیادہ دیر لیٹی نہ رہ سکی۔ فوراً ہی اس سے الگ ہوکر حیرانی سے تکنے لگی۔ وہ ایسی حرکتیں کر رہی تھی جیسے ننھے دودھ پینے والے بچے کرتے ہیں۔

اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، تم جوان ہوگئی ہو، تمہاری آنٹی عاصمہ نے تقریباً بیس برس سے کسی بچے کو جنم نہیں دیا ہے۔ ان کے پاس دودھ کا قدرتی ذخیرہ نہیں ہے پھر تمہاری آنٹی کیسے تمہارا مطالبہ پورا کرتی ہیں؟''

''آپ جھوٹ کہتی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ میری آنٹی تو مجھے بچپن سے اسی طرح دُودھ پلاتی آ رہی ہیں۔ وہ مجھے ہر رات پلاتی ہیں۔''

رضوانہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

نیلما نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے نہیں سلا سکتیں۔ اگر ایسا نہیں کرسکتیں تو آپ کس بات کی ڈاکٹر ہیں؟''

رضوانہ بے طرح پریشان ہوگئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ کوارٹر کے باہر زبیر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا ایک جونیئر آفیسر تھا۔ رضوانہ کے جی میں آیا، اسے عاصمہ کے فراڈ کے متعلق کھل کر بتا دے لیکن کوارٹر سے باہر سامنا ہوتے ہی وہ جلدی جلدی اپنے دوپٹے کو درست کرنے لگی۔ جیسے کوارٹر کے اندر کا راز باہر آ کر کھل رہا ہو۔

زبیر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر! کیا بات ہے؟''

وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''کک...... کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں، بس وہ سونا نہیں چاہتی۔ آنٹی کے لئے ضد کر رہی ہے۔ شاید تم اسے سلا سکو، میں اپنے چیمبر میں انتظار کروں گی۔''

یہ کہتے ہی وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی زبیر کے پاس سے گزرتی ہوئی چلی گئی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر آیا، نیلما بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چہرہ تپنے لگا۔ جی میں آیا، ابھی اٹھ کر باتھ روم میں جائے اور چلو میں پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارنے لگے۔ وہ جہاں بیٹھی ہوئی تھی، وہیں سمٹنے لگی گویا قدرتی طور پر شرم و حیا اور سمٹنے کی ادائیں اس میں آپ ہی آپ پیدا ہو رہی تھیں۔ زبیر نے بتیاں بجھا دیں۔ صرف زیرو پاور کی ہلکی نیلی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اچھی لڑکیاں کھانا کھانے کے بعد لان میں ٹہلتی ہیں۔ پھر بستر پر آ کر سو جایا کرتی ہیں، چلو سو جاؤ۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں آنٹی کے پاس جاؤں گی۔ وہ مجھے سلائیں گی۔''

''ڈاکٹر نے صاف طور سے کہہ دیا ہے، پندرہ دن سے پہلے آنٹی کو دیکھ بھی نہیں سکو

گی۔ ضد کرنا فضول ہے۔ چپ چاپ آ کر لیٹ جاؤ۔ میں تمہیں تھپک تھپک کر سلا دوں گا۔''

''میں دودھ پیوں گی۔ پھر سو جاؤں گی۔''

''جو لڑکیاں وقت پر نہیں سوتیں، انہیں اللہ بابا پکڑ کر لے جاتا ہے۔''

اللہ بابا کا نام سنتے ہی وہ تڑپ کر آئی اور زبیر کے بازوؤں میں چھپ گئی۔ اس نے اسے چھپا لیا۔

وہ رات نیلما کے لئے بڑی سنسنی خیز تھی کہتے ہیں، لوگ راتوں رات دولت مند بن جاتے ہیں۔ زبیر نے اسے راتوں رات خوشیوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ صرف سونا چاندی اور کرنسی نوٹوں کو دولت نہیں کہتے، اصل دولت تو خوشیاں ہوتی ہیں، مسرتیں ہوتی ہیں جو دولت مندوں کو بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ نیلما کو جو مسرتیں حاصل ہو رہی تھیں، انہیں وہ اچھی طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یہ مسرتوں بھری رات کیسی ہے؟ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ اسی رات کے لئے زندہ تھی۔ آج اس کی آنٹی نے اسے دودھ نہیں پلایا تھا لیکن اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے زبیر کا چہرہ بھی گھوم رہا تھا۔ زبیر نے اس کی عادت کو، اس کی فطرت کو اور اس کے مزاج کو اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

نیلما کو یہ یاد نہیں رہا کہ کب تک اس کا سر گھومتا رہا اور کب تک وہ کیف و سرور کی دنیا میں گم ہوتے ہوتے سو گئی۔ زندگی میں پہلی بار افیون نے شکست کھائی تھی۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر رضوانہ اپنے چیمبر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے لیکن وہ خیالوں میں گم تھی، اسے نیلما کا انداز یاد آ رہا تھا۔ وہ ممتا کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے، آنٹی عاصمہ کو یاد کرتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور رضوانہ سوچ رہی تھی۔ اگر میں شادی کر لیتی اور میرا کوئی جیون ساتھی ہوتا، پھر میں بچوں کی ماں بنتی تو بچے اسی طرح ممتا کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے میرے سینے سے لگ جاتے جس طرح وہ لگ رہی تھی۔

رضوانہ، نیلما کو یاد کر رہی تھی اور اس کے اندر کنواری ممتا تڑپ رہی تھی۔ جی میں آتا تھا، چھوٹے ننھے سے بچے نہ سہی، نیلما کو ہی اپنے سینے سے لگا لے، اسے اتنا پیار دے کہ وہ عاصمہ کی زہریلی ممتا کو بھول کر ایک لیڈی ڈاکٹر کی ممتا کو ہمیشہ یاد رکھے۔

وہ فون کی گھنٹی سن کر چونک گئی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو۔''

دوسری طرف سے زبیر کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو ڈاکٹر رضوانہ! آپ کا ایک نسخہ ناکام رہا، دوسرا کامیاب رہا۔ وہ سہاگ کی سیج پر آرام سے سو گئی ہے۔''

''اوہ مسٹر زبیر، تم نے میری کتنی ہی پریشانیوں کو ختم کر دیا ہے۔ میں خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔ آج سے عاصمہ اور اس کے شوہر چنگیزی کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ ہم بڑی کامیابی سے ایک نادان سہاگن کا علاج کر سکیں گے۔ زبیر، میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہیں نیلما کے پاس جانے کی اجازت دی تھی۔ تم اس کے مجازی خدا ہو، اس کے محافظ ہو۔ اس کے ہر طرح سے ذمے دار ہو، لہٰذا تم ہمیشہ اس کے پاس رہا کرو۔ اب بہت رات ہو چکی ہے، میں جا رہی ہوں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ کرسی کی پشت سے شال اٹھا کر اپنے شانوں پر ڈالی۔ پھر چیمبر سے نکل کر ہسپتال کے پورچ میں آ گئی۔ ڈرائیور کار لے آیا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھی، عاصمہ اور چنگیزی کو ان کی سازشوں کا بھرپور جواب دینے والی تھی۔ اس نے

ڈرائیور سے کہا۔ ''تم پیچھے بیٹھو۔''

وہ پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ رضوانہ نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی۔ پھر ڈرائیونگ کرتے ہوئے مین شاہراہ پر آ گئی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ڈرائیور نے کہا۔ ''مالکن! میں نے برسوں آپ کا نمک کھایا ہے۔ میرے بچے یہ نمک کھاتے کھاتے جوان ہو گئے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں، میری ایک جوان بیٹی ہے۔''

''جانتی ہوں اور تم سے کہہ چکی ہوں، جب اس کی شادی کی بات چلے تو مجھ سے کہنا۔ میں اپنے اخراجات پر اسے ڈولی میں بٹھاؤں گی۔''

''آپ کی سخاوت کا جواب نہیں ہے لیکن ڈولی اٹھنے سے پہلے ہی کوئی میری بیٹی کو اٹھا کر لے جائے اور مجھ سے مطالبہ کرے کہ اپنی مالکن کو ریوالور کے زور پر اس کے پاس پہنچاؤں، تب میری بیٹی صحیح سلامت واپس ملے گی۔ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

رضوانہ ذرا پریشان ہوئی۔ پھر اس نے اندرونی عقب نما آئینے کا زاویہ بدلتے ہوئے پچھلی سیٹ پر ڈرائیور کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ اس کی طرف ریوالور بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''مالکن! پتہ نہیں، وہ کون لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا، میں آپ کو ان کے اڈے پر لے جاؤں۔ اگر آپ کار ڈرائیو کریں تو میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ریوالور کی نال آپ کی گردن سے لگا دوں تاکہ میرے بتائے ہوئے راستے پر چلتی رہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ آپ کی گردن سے ریوالور کی نال لگاؤں لیکن میرا دل اندر سے تڑپ رہا ہے۔ میری جوان بیٹی ان کے قبضے میں ہے۔ میں کیا کروں؟''

رضوانہ نے کار کی رفتار سست کر دی۔ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگی، پھر کہنے لگی۔ ''میں نے اپنی جوانی یونہی گزار دی۔ میرے نصیب میں ڈولی اٹھانے والے بہت آئے لیکن میں نے کسی کو تسلیم نہیں کیا۔ تمہیں اپنی جوان بیٹی کی آبرو ضرور بچانا چاہئے۔ یہ میں کہہ رہی ہوں۔ میری گردن سے ریوالور کی نال لگاؤ اور مجھے وہیں لے چلو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''مالکن، میرا ضمیر مجھے مار ڈالے گا۔''

''ضمیر مار ڈالے تو مر جانا لیکن بیٹی کی عزت بچا لینا۔ جو کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کرو۔''

تھوڑی دیر بعد وہ ایسے بنگلے میں پہنچے جسے چنگیزی خفیہ عیش کدے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ رضوانہ کو اندازہ تھا کہ دشمن کون ہو سکتا ہے۔ ڈرائیور نے مجبور ہو کر ریوالور کی نال اس کی گردن سے لگا دی تھی۔ بنگلے میں پہنچ کر وہ اسی طرح اپنی مالکن کو ریوالور کی زد میں لے کر اندر پہنچا۔ اندر چنگیزی موجود تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں ہمیشہ کھلونوں سے کام نکال لیتا ہوں۔ نیلما کے ہاتھ میں بھی کھلونا رائفل تھی۔ تمہارے اس ڈرائیور کے پاس بھی کھلونا ریوالور ہے لیکن یہ پہچان نہ سکا کیونکہ اس نے کبھی جرم نہیں کیا اور نہ ہی ایسے ہتھیار استعمال کئے ہیں۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ کھلونا ریوالور دیا تھا۔ تم اس کے ساتھ آنے پر آمادہ نہ ہوتیں اور اس کی رپورٹ پولیس میں لکھوانا چاہتیں تو خود تماشا بن جاتیں۔ تمہارے سامنے پولیس والے اس سے ریوالور طلب کرتے تو ان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہی آتا۔''

وہ قہقہے لگانے لگا۔ رضوانہ نے کہا۔ ''تم اپنی ذلالت اور کمینگی پر کتنے خوش ہوتے ہو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی دو آدمی ڈرائیور کی جوان بیٹی کو کمرے میں لے آئے۔ چنگیزی نے کہا۔ ''میں تو پیدائشی ذلیل اور کمینہ ہوں۔ اب تمہی فیصلہ کرو۔ ایک طرف تم ہو، دوسری طرف تمہارے وفادار، نمک خوار ڈرائیور کی جوان بیٹی ہے۔ تم میں سے کسے میری خواب گاہ میں آنا چاہئے؟''

ڈرائیور نے اس کے قدموں پر جھکتے ہوئے کہا۔ ''میری مالکن کو چھوڑ دیجئے، میری بیٹی کو مار ڈالئے۔''

چنگیزی نے ڈرائیور سے کہا۔ ''ابے اُلو کے پٹھے، تیری وفاداری مستحکم ہوتی تو مالکن کو یہاں نہ لاتا مگر تو کشمکش میں تھا۔ اپنی بیٹی کو بھی بچانا چاہتا تھا۔ اپنی مالکن سے بھی وفاداری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ تو نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ اس لئے تیری وفاداری کسی کام نہیں آئے گی۔ اگر بیٹی کی عزت چاہتا ہے تو اسے فوراً لے جا۔ ایسا نہ ہو دونوں پر میری نیت خراب ہو جائے۔''

رضوانہ نے ڈرائیور سے کہا۔ ''بیشک، تم کشمکش میں رہے۔ وفادار بھی رہنا چاہتے تھے، بیٹی کو بھی بچانا چاہتے تھے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ میرا حکم ہے، فوراً اسے یہاں سے لے جاؤ۔''

وہ اپنی بیٹی کے پاس پہنچ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''مالکن! آپ جیسی عظیم عورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔''

چنگیزی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور مجھ جیسا کمینہ شخص بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ ایک بات یاد رکھو، یہاں سے جا کر تم نے میرے متعلق کسی سے کچھ کہا تو یہ لڑکی کسی وقت بھی اٹھالی جائے گی۔ تم ایک غریب ڈرائیور ہو۔ تمہارے گھر میں پولیس والے پہرا دینے نہیں آئیں گے۔ یہ امیروں کے چونچلے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی بیٹی کی عزت کو داؤ پر لگانا چاہو تو اپنی مالکن کے متعلق پولیس میں رپورٹ درج کرا دینا۔ اب یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

وہ بیٹی کا ہاتھ تھام کر دروازے تک گیا۔ پھر بڑی بے بسی سے مالکن کو دیکھا۔ وہ رو رہا تھا اور آنسو پونچھ رہا تھا۔ پھر وہ بیٹی کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ چنگیزی نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ لیا تم نے، ایک غلام کتنا ہی وفادار ہو، اسے اپنی جوان بیٹی کی عزت اپنی وفاداری سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔''

رضوانہ نے کہا۔ ''یہی بات تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ باپ امیر کبیر ہو یا ایک معمولی ڈرائیور، سب کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے۔ میں بھی کسی کی بیٹی تھی مگر تم نے میری عزت کا مذاق اڑایا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''آج پھر مذاق بن گئی ہو۔ آج سے پچیس برس پہلے تمہیں ہاتھ لگایا تھا۔ پچیس برس بعد آج پھر یہ موقع مل رہا ہے۔''

''پچیس برس پہلے بھی تم نے مجھ پر ظلم کیا تھا۔ آج بھی ظالم کے روپ میں سامنے آئے ہو۔''

چنگیزی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ رضوانہ نے محسوس کیا فلش لائٹ کی طرح چاروں طرف سے روشنیاں کوند رہی ہیں۔

چنگیزی نے کہا۔ ''تم ذرا بھی اعتراض کرو گی تو ڈرائیور اپنی جوان بیٹی کو زیادہ دور نہیں لے جا سکے گا۔''

وہ مجبور ہو گئی، پچیس برس پہلے بھی خود کو ہار چکی تھی۔ ایک غریب اور وفادار ڈرائیور کی معصوم بیٹی کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

☆======☆======☆

زبیر اپنی شریکِ حیات کو کسی حد تک قابو میں کرتا جا رہا تھا۔ دوسرے دن اس نے ڈاکٹر رضوانہ کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آئی۔ اس نے کوٹھی میں فون کر کے معلوم کیا۔ اسے ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''جناب! ہماری مالکن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔''

زبیر نے ڈرائیور کی آواز میں کپکپاہٹ محسوس کی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر ایسے بول رہا تھا، جیسے سوچ سوچ کر پلاننگ کر رہا ہو اور اس پلاننگ کے مطابق بولتا جا رہا ہو۔ انٹیلی جنس بیورو کے ٹریننگ کالج میں اسے سمجھایا گیا تھا۔ سب سے پہلے مجرم کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو۔ جھجک موجود نہ ہو تو اس کی آواز کو پہچانو۔ اس کی آواز میں ہلکی سی بھی لرزش ہو تو سمجھو، وہ صحیح بیان دینے سے گریز کر رہا ہے۔ اگر اس کی آواز میں ہچکچاہٹ ہو تو سمجھو، وہ شرم کے مارے صحیح بیان نہیں دینا چاہتا۔ اگر بولنے کے دوران ذرا سا بھی ہکلاہٹ میں مبتلا ہو تو وہ خود مجرم ہے اور اپنے جرم کو چھپانے کی ناکام کوشش میں مبتلا ہے۔ ایک سچا آدمی بے اختیار سچ بولتا چلا جاتا ہے اور جھوٹ بولنے والا کہیں نہ کہیں ٹھہرتا ہے اس سے کوئی نہ کوئی لغزش ہوتی ہے۔

زبیر اس سے فون پر بات کرنے کے دوران کچھ یہی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے شام تک رضوانہ کا انتظار کیا۔ پھر خود ہی اس کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ ملازم سے پتہ چلا کہ وہ ابھی باہر سے آئی ہے۔

زبیر نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ کو میرا نام بتاؤ۔ وہ مجھ سے ضرور ملاقات کریں گی۔''

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ باہر شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اسے واپس نیلما کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ وہ رات ہوتے ہی ڈرنے لگتی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد ملازم نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ آپ کو بیڈ روم میں بلا رہی ہیں۔''

وہ ملازم کے ساتھ بیڈ روم میں پہنچا۔ وہاں تاریکی تھی۔ اسے رضوانہ کی تھکی تھکی سی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے افسوس ہے، میں لائٹ آن نہیں کر سکوں گی۔ میری آنکھیں دکھ رہی ہیں۔''

باہر سے آنے والی روشنی میں کمرے کی چیزیں کچھ کچھ چمک رہی تھیں۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بخار آ گیا تھا، اب نہیں ہے مگر آنکھیں ویسے ہی دکھ

رہی ہیں۔ ابھی دوا ڈال کر لیٹی ہوں۔''

''میں نے خواہ مخواہ زحمت دی۔ کیا آپ کل صبح آ سکیں گی۔''

''شاید نہ آ سکوں۔ تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔ اگر نیلما کے سلسلے میں کچھ مشورے لینا ہوں تو فون کے ذریعے رابطہ قائم کر لینا، میرا خیال ہے۔ تم اسے اچھا ٹریٹمنٹ دے سکو گے۔ وہ نارمل ہو جائے گی۔ میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔''

''مجھے اجازت دیں۔ وہ تنہا ڈر رہی ہو گی۔''

''پہلی بار میرے گھر آئے ہو۔ میں نے ایک پیالی چائے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''جب آپ صحت مند ہو جائیں گی تو میں خود ہی آ کر پی لوں گا۔''

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد رضوانہ نے ملازم کو بلا کر پوچھا۔ ''کیا وہ صاحب چلے گئے؟''

''جی ہاں، جا چکے ہیں۔''

''دروازہ بند کر دو۔''

ملازم دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے اوپر سے چادر کو ہٹایا۔ پھر سوئچ بورڈ کے پاس آ کر لائٹ آن کر دی۔ جہاں وہ کھڑی تھی، اس کے مخالف سمت ایک قد آدم آئینہ تھا۔ آئینہ جو دکھا رہا تھا، اگر وہ زبیر دیکھ لیتا تو نیلما، دادا جان اور رضوانہ کے سلسلے میں بڑے اہم انکشافات ہونے لگتے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئینے کے پاس آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سوج گیا تھا۔ اس کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانت پیستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی گہرائی، اتنی سنجیدگی اور اتنا غیظ و غضب بھرا ہوا تھا، جیسے وہ خیال ہی خیال میں اپنے دشمن کا گلا گھونٹ رہی ہو۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی، وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پلنگ کے سرے پر بیٹھ گئی۔ ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو'' دوسری طرف سے چنگیزی کی آواز سنائی دی۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''ابھی میں تمہارا گلا گھونٹ رہی تھی۔''

اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے فون پر رپورٹ ملی ہے۔ زبیر تم سے ملنے آیا تھا۔''

''وہ جا چکا ہے۔''

''مجھے یقین ہے، تم بڑی حیا والی ہو، اپنے لٹنے کی داستان نہیں سناؤ گی۔''

''میں تم سے اتنی شدید نفرت کرتی ہوں کہ فون پر بھی تمہاری آواز نہیں سننا چاہتی۔''

''بیشک نہ سنو مگر عقل سے کام لینا۔ میری دو شرطیں پوری ہونی چاہئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میری بیوی عاصمہ کے سینے کا راز فاش نہیں ہونا چاہئے، دوسری شرط کے مطابق تم میری بیوی عاصمہ کو نیلما سے ملنے کی اجازت دیا کرو گی۔''

''مجھے تمہاری پہلی شرط منظور ہے۔ میں عاصمہ کے سلسلے میں کسی بھی راز کا ذکر نہیں کروں گی لیکن اسے ہسپتال میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتی کیونکہ عدالت کی طرف سے ممانعت ہے۔''

''عدالت کا فیصلہ ہسپتال میں بدلا جا سکتا ہے۔ کوئی وہاں دیکھنے نہیں آئے گا۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ زبیر روزانہ آتا ہے۔ پھر پولیس والے چکر لگاتے ہیں۔ کسی نے عاصمہ کو یا تمہارے کسی اور رشتے دار کو دیکھ لیا تو مجھے عدالت میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔''

وہ نہایت ہی معقول باتیں سمجھا رہی تھی۔ چنگیزی نے ذرا سوچنے کے بعد کہا۔ ''اچھی بات ہے، جو کام عاصمہ وہاں آکر نہیں کر سکتی، وہ تم کر سکتی ہو۔''

''تم چاہتے ہو، میں نیلما کو دودھ میں افیون گھول کر دیا کروں؟''

''ہاں، تم ایسا کرو گی۔''

''مجھے مجبور نہ کرو۔ کیوں اس معصوم لڑکی کی زندگی میرے ہاتھوں برباد کرانا چاہتے ہو؟''

''تم اپنی زندگی کے متعلق سوچو۔ تم نے ایک بہت ہی تجربے کار ڈاکٹر کی حیثیت سے نام کمایا ہے۔ دور دور تک تمہاری شہرت ہے۔ سوسائٹی میں تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ تمام تصویریں ہاتھوں ہاتھ پہنچیں گی تو تمہاری عزت کا کیا بنے گا۔ تمہارے سلسلے میں اسکینڈل شروع ہوں گے کہ پچیس برس سے تم نے کنوارے پن کا ڈھونگ رچایا تھا اور در پردہ عیاشی کرتی رہی تھیں۔''

وہ چپ چاپ سن رہی تھی اور اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ چنگیزی نے کہا۔ ''جب تک

نیلما تمہارے ٹریٹمنٹ میں رہے گی، میں یہ دیکھنے نہیں آؤں گا کہ تم میرے احکامات کی تعمیل کر رہی ہو یا نہیں؟ لیکن ہسپتال سے باہر آنے کے بعد نیلما کی ذہنی حالت سے صاف پتا چل جائے گا۔ وہ دماغی طور پر صحت مند ہو گی تو تمہاری عزت اور شہرت سے بھرپور زندگی ہمیشہ کے لئے خاک میں مل جائے گی۔''

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ رضوانہ اسی طرح ریسیور تھامے بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس نے ایک شریف لڑکی کی عزت بچانے کی خاطر خود کو داؤ پر لگایا تھا۔ اس کے بعد مزید داؤ پر لگتی جا رہی تھی۔ وہ ایک رات اور ایک دن چنگیزی کی قید میں رہ کر آئی تھی۔ اس نے شراب کے نشے میں اپنی بدمستیوں کے دوران ڈینگیں مارتے ہوئے وہ تمام باتیں بتا دیں جو کسی کو نہ بتاتا۔ وہ باتیں اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی تھیں لیکن رضوانہ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آگئی تھی، اگر وہ اپنی کمزوریوں کا خیال نہ کرتی، اپنی عزت کو خاک میں ملانے کا عزم کر کے عدالت میں اس کا کچا چٹھا سنا دیتی تب بھی اس بات کا ثبوت نہ ہوتا کہ چنگیزی واردات کے دن اسی شہر میں موجود تھا اور اس نے نیلما کے دادا جان کو قتل کیا ہے۔

اس کی ڈینگیں سننے کے بعد پتا چلا، وہ اپنے بیٹے ارباب چنگیزی کے ساتھ ملتان گیا تھا، ان کے ساتھ ایک اور بھی شخص تھا جو چنگیزی کے ٹکٹ پر سفر کر رہا تھا۔ چنگیزی دوسرے نام سے ٹکٹ بنوا کر گیا تھا۔ وہاں اپنے علاقے میں پہنچ کر لوگوں سے ملاقات کی تھی۔ پھر بیماری کا بہانہ کر کے اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود ہو گیا تھا۔ واردات صبح دس بجے ہوئی تھی، وہ بذریعہ ہوائی جہاز پچھلی رات کو ملتان سے لاہور اور لاہور سے کراچی پہنچ گیا تھا۔ صبح دس بجے اس نے غازی جمال الدین کو گولی ماری۔ دوپہر کی فلائٹ سے پہلے لاہور پہنچا پھر وہاں سے ملتان آیا۔ اس علاقے کے اور اس محلے کے لوگ اس بات کے گواہ تھے کہ واردات کے دن چنگیزی اور اس کا بیٹا ارباب چنگیزی دونوں ہی ملتان میں تھے۔

زبیر نے جاسوسی کے سلسلے میں جو ٹریننگ حاصل کی تھی، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چنگیزی پر شبہ کرتا تھا لیکن اس کے خلاف ثبوت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے محکمے کے جونیئر جاسوس کو ملتان روانہ کیا تھا۔ اس نے آکر یہی رپورٹ دی کہ چنگیزی اور اس کا بیٹا ارباب چنگیزی دونوں ہی واردات کے دن ملتان میں موجود تھے۔ اس کے بعد ان پر

شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ زبیر ابھی جوان تھا، کوئی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر آنے والا جاسوس بھی ان باپ بیٹے کو قاتل ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

جب سے نیلما ہسپتال میں آئی تھی، تب سے عدالت میں دو بار پیشی ہوئی تھی۔ وہ علاج کے دوران پہلی بار عدالت میں حاضر ہوئی تو چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ سرکاری وکیل نے اسے کٹہرے میں بلا کر پوچھا۔ ''تم میں یہ تبدیلی کیوں آئی ہے۔ پہلے تو تم برقع یا چادر استعمال نہیں کرتی تھیں۔''

نیلما نے دور بیٹھی ہوئی رضوانہ اور زبیر کو دیکھنے کے بعد کہا۔ ''ڈاکٹر رضوانہ نے سمجھایا ہے کہ میں جوان ہو چکی ہوں اور میں نادان بھی ہوں لہٰذا اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا چاہئے۔''

وکیل نے پوچھا۔ ''کیا تم اب بھی دودھ پیتی ہو؟''

''جی ہاں، ڈاکٹر رضوانہ نے سمجھایا ہے، میں جوان ہو چکی ہوں، ننھی بچی نہیں ہوں لہٰذا فیڈر سے نہیں، گلاس سے پینا چاہئے۔''

''کیا تمہیں دودھ میں آج بھی پہلے جیسی لذت ملتی ہے؟''

''جی ہاں، دودھ پہلے جیسا لذیذ ہوتا ہے۔''

عاصمہ اور چنگیزی وہاں بیٹھے اس کا بیان سن رہے تھے۔ نیلما کی یہ بات سن کر انہیں اطمینان ہو رہا تھا۔ چنگیزی مسکراتا ہوا، مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا دور بیٹھی ہوئی رضوانہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی بیوی عاصمہ کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''اسے کہتے ہیں، شطرنج کی چال۔ تم نے اسے ختم کرنے کے لئے کہا تھا مگر یہ ڈاکٹر زندہ بھی ہے اور ہمارے کام بھی آ رہی ہے۔''

عاصمہ زیر لب مسکرانے لگی۔ چنگیزی نے اسے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رضوانہ کو اغوا کرنے کے بعد چار غنڈوں کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ غنڈے اسے نوچتے کھسوٹتے رہے تھے اور اس کی شرمناک تصویریں اتارتے رہے تھے۔ ان تصاویر کی ایک کاپی رضوانہ کے پاس پہنچا دی گئی ہے جس کے نتیجے میں اس کی زبان بند ہو چکی ہے۔ اب وہ ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکے گی۔

عدالت برخاست ہونے کے بعد عاصمہ نے ڈاکٹر رضوانہ کے پاس آ کر کہا۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں۔''

رضوانہ نے اس کے ساتھ عدالت کے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ ''کس بات کا شکریہ ادا کر رہی ہو؟''

''میں خوفزدہ تھی، کہیں تم میرے ایک جسمانی عیب کو عدالت میں ظاہر نہ کر دو۔ نیلما کے دودھ پینے کا تعلق اس کمی سے تھا جو میرے جسم میں ہے۔''

''عاصمہ! میں نے یہ راز چھپا کر تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے، میں تو چنگیزی کی ہدایات پر عمل کر رہی ہوں مگر تمہارے شوہر کے حکم کی تعمیل کیوں کر رہی ہوں، یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں سب سمجھتی ہوں۔''

ڈاکٹر رضوانہ نے کہا۔ ''یہی تو عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ سب سمجھتی ہے مگر کچھ نہیں سمجھتی۔''

عاصمہ نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے ذرا پریشان ہو کر دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''اگر تمہارے پیٹ میں بات رہ سکتی ہے اور تم اپنے شوہر سے کوئی بات چھپا سکتی ہو تو کچھ عرصے کے لئے خود کو اس سے چھپاؤ اور دیکھو کہ وہ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ دیانتدار ہے۔ کیا تم زندگی کے کسی موڑ پر اس سے دھوکا تو نہیں کھاؤ گی؟''

اس نے تن کر کہا۔ ''بکواس مت کرو۔ مجھے اپنے شوہر پر اعتماد ہے، میں تمہارے بہکاوے میں نہیں آؤں گی۔''

''اپنے شوہر پر اعتماد کرنا اور اس کی توہین برداشت نہ کرنا، بڑی اچھی بات ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تم میرے بہکانے سے بہک جاؤ۔''

وہ دور کھڑے ہوئے سرکاری وکیل کے پاس گئی۔ پھر اس کے ساتھ دوسری طرف جانے لگی۔ عاصمہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ وہ چنگیزی پر کسی طرح کا شبہ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن رضوانہ نفسیات کی ماہر تھی۔ اس نے عاصمہ کے دل اور دماغ میں شک کا بیج بو دیا تھا۔

دوسرے دن چنگیزی نے فون کے ذریعے پوچھا۔ ''رضوانہ تم نے عاصمہ سے کیا کہہ دیا ہے؟''

''میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''تم ضرور کوئی چال چل رہی ہو۔ وہ مجھ سے اچانک ناراض ہوگئی ہے۔''

''یہ سن کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ چنگیزی، میں چاہے تم سے جتنی بھی نفرت کروں لیکن تمہارے سوا کسی دوسرے مرد کا تصور نہیں کر سکتی۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو! تم...... تم جو مجھ سے سخت نفرت کرتی ہو اور خیال ہی خیال میں میرا گلا گھونٹنے لگتی ہو۔''

''وہ تو میں جنون کی حالت میں ایسا کہہ جاتی ہوں ورنہ ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے خود اپنا تجزیہ کرتی ہوں تو تسلیم کرتی ہوں کہ تم ہی میری زندگی کے پہلے اور آخری مرد ہو خواہ میں اس بات سے کتنا ہی انکار کرتی رہوں، حقیقت نہیں بدلے گی۔ بہ ظاہر میں تم سے نفرت کرتی رہوں گی اور باطن میں تمہاری شخصیت سے متاثر ہوتی رہوں گی۔''

دوسری طرف یکسر خاموشی چھا گئی تھی۔ جیسے وہ سن رہا ہو اور فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا ہو۔ رضوانہ نے پوچھا۔ ''خاموش کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں؟''

''میں تمہاری نفسیاتی پیچیدگیوں میں الجھ گیا ہوں۔ سوچتا ہوں، تم درست کہہ رہی ہو لیکن میں محتاط رہنے کا عادی ہوں لہٰذا ابھی تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔''

''بیشک، اعتماد نہ کرو۔''

ایسا کہتے ہوئے رضوانہ نے کیسٹ ریکارڈر کے بٹن کو دبایا۔ اب ان کی گفتگو ریکارڈ ہونے لگی۔ پھر وہ بولی۔ ''چنگیزی! یہ بتاؤ، میں پچیس برس کے بعد تمہیں کیسی لگتی ہوں۔''

اس نے سرد آہ بھرنے کے انداز میں زور سے سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہ پوچھو۔ اگر میں شاعر ہوتا تو تمہارے حسن و شباب کی تعریف میں پورا ایک دیوان لکھ جاتا۔''

''مجھے دیوان نہیں لکھوانا ہے، صرف اتنا بتا دو، عاصمہ کے مقابلے میں کیسی لگتی ہوں۔''

''تم نے بھی کس عورت کا نام لیا ہے۔ عاصمہ ایک بیوی ہے، ایک ماضی ہے جس کے متعلق اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ۔۔

''یادِ ماضی عذاب ہے یارب، چھین لے مجھ سے عاصمہ بیگم۔''

دونوں قہقہے لگانے لگے پھر چنگیزی نے کہا۔ ''رضوانہ! سچ پوچھو تو تمہارے ساتھ ایک رات اور ایک دن گزار کر میں پھر سے جوان ہو گیا ہوں، کیا آج ملو گی؟''

''آج نہیں، کل۔''

''چلو کل ہی سہی مگر کہاں؟''

''تم جہاں بلاؤ گے، چلی آؤں گی۔''

''میں ہوٹل میں کمرا ریزرو کراؤں گا، کل صبح تمہیں ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتا دوں گا۔''

دونوں میں یہ معاملہ طے پا گیا۔ پھر فون کی گفتگو ختم ہوگئی۔ رضوانہ نے ریسیور رکھتے ہی کیسٹ ریکارڈر کو آف کر دیا۔ اس کے تیسرے دن زبیر نے رضوانہ سے ملاقات کی۔ پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''پھر کہتے کیوں نہیں، اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں آپ کے ذاتی معاملے پر کچھ کہوں گا۔''

''چلو، وہ بھی سن لوں گی۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ آپ پچھلی رات ایک بہت ہی معروف مگر بدنام ہوٹل میں چنگیزی کے ساتھ رات گزار چکی ہیں؟''

''تم جاسوس ہو، میں تمہاری معلومات کو چیلنج نہیں کروں گی۔''

''ڈاکٹر! یہ کہہ کر آپ میرا دل توڑ رہی ہیں۔ میں آپ کو اپنا آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ آپ ایسی مہربان اور بزرگ خاتون ہیں جن کے نقشِ قدم پر دوسری لڑکیوں کو چلنا چاہئے اور آپ ہیں کہ اپنے کردار کو مشکوک بنا رہی ہیں۔ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟''

رضوانہ نے ایک گہری سانس لی۔ پھر خلا میں تکتے ہوئے، کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہمارے پاؤں کیچڑ میں دھنس جائیں اور پتا چلے کہ اس پار جانے کے لئے کچھ اور کیچڑ میں دھنسنا ہوگا مگر پار لگ جائیں گے تو اس یقین کے ساتھ انسان کیچڑ میں دھنستا چلا جاتا ہے۔''

''پلیز، اپنی باتوں کی وضاحت کریں۔''

''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''معلوم ہوتا ہے، آپ چنگیزی کے متعلق بہت کچھ جانتی ہیں۔ کیا آپ دادا جان کے قتل کے سلسلے میں مدد نہیں کریں گی؟''

وہ چپ رہی۔ زبیر نے چند لمحوں تک انتظار کیا۔ پھر کہا۔ ''میں غلطی پر ہوں۔ آپ

چنگیزی سے اس حد تک متاثر ہیں کہ اپنی عزت کا خیال نہ کرتے ہوئے ایک ہوٹل میں اس کے ساتھ وقت گزار سکتی ہیں۔ آپ سے کسی مدد کی توقع فضول ہے۔''

وہ جانے کے لئے اٹھ گیا، پھر بولا۔ ''یہ معلوم کرنے کے بعد کہ آپ کے کردار میں پختگی نہیں ہے، میں اپنی بیوی کو یہاں زیادہ عرصے تک چھوڑنا پسند نہیں کروں گا۔''

''مسٹر زبیر! اگلی پیشی تک تم نیلما کو یہاں سے نہیں لے جاسکو گے۔ میری مخالفت کرو گے تو میں نیلما سے ملنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

وہ پریشان ہو کر رضوانہ کو دیکھنے لگا۔ نیلما اس کی زندگی کا بہت ہی خوب صورت اور اہم حصہ بن چکی تھی۔ نہ وہ اس کے بغیر رہ سکتی تھی، نہ یہ اس کے بغیر رہ سکتا تھا۔ اس نے مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھی بات ہے، میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا۔ مجھے نیلما عزیز ہے۔''

اس نے رضوانہ پر نفرت کی ایک نگاہ ڈالی۔ پھر وہاں سے چلا آیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا، ڈاکٹر رضوانہ، نیلما کے علاج کو خواہ مخواہ طول دے رہی تھی لیکن میاں بیوی کو ملنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی۔ اس بات کو اس نے عاصمہ اور چنگیزی سے راز میں رکھا تھا۔ تین ماہ کے بعد پھر پیشی ہوئی۔ یعنی نیلما جب سے رضوانہ کے زیرِ علاج تھی، تب سے وہ دو ماہ بعد عدالت میں حاضر ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر تین ماہ بعد حاضر ہو رہی تھی۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں آکر کھڑی ہوئی تو سرکاری وکیل نے کہا۔ ''ڈاکٹر رضوانہ نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ تمہارے بدن پر چادر نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا اسے اتار دو۔''

نیلما نے رضوانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر بولی۔ ''ہاں نیلما! اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اسے اتار دو۔''

اس نے چادر کو اور مضبوطی سے اپنے اطراف لپیٹ لیا۔ پھر زبیر کی طرف دیکھا۔ زبیر نے کہا۔ ''میں بھی تم سے کہتا ہوں، اسے اتار دو۔''

پھر یوں لگا جیسے زبیر کا حکم پہلا اور آخری ہو۔ اس کے بعد وہ کسی اور کی بات سننا پسند نہ کرتی ہو۔ اس نے چادر اتار کر ایک طرف کٹہرے پر رکھ دی اور اس کے ساتھ ہی عاصمہ اور چنگیزی ایک دم سے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے، کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ نادان بچی

جو عاصمہ کے سینے سے لگ کر دودھ پیتی تھی اور گہری نیند سو جاتی تھی، اب ماں بننے والی تھی۔

عاصمہ نے ایک دم سے تڑپ کر کہا۔ ''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ نیلما میری بہو بننے والی تھی میرے بیٹے سے شادی ہونے والی تھی۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر رضوانہ نے ہسپتال کو ایک چکلہ بنایا ہے۔ میں اپنی بھتیجی کی تباہی و بربادی کے خلاف عدالت سے درخواست کروں گی کہ اس سے جواب طلب کیا جائے۔''

منصفِ اعلیٰ نے عاصمہ کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ وکیل صفائی نے رضوانہ کو دوسرے کٹہرے میں بلا کر پوچھا۔ ''یہ کیا تماشا ہے؟ یہ کس طرح ماں بن رہی ہے؟ کیا اسے دیکھ کر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم بے حیا اور تمہارے ہسپتال کا ماحول شرمناک ہے؟''

''وکیل صاحب، مجھے بے حیا کہنے اور میرے ہسپتال کے ماحول کو شرمناک کہنے سے پہلے اپنی زبان کو لگام دیں۔ ورنہ میں ہتک عزت کا دعویٰ کروں گی۔ کیا آپ اتنے نادان وکیل ہیں کہ آپ کو نیلما کے بیاہتا ہونے کا علم نہیں ہے؟ کیا وہ اپنے شوہر زبیر کے ساتھ ایک جگہ نہیں رہ سکتی؟ کیا کوئی قانون اسے روک سکتا ہے؟ جب قانون نہیں روک سکتا تو میں کیسے روک سکتی تھی۔ زبیر دن رات میرے ہسپتال میں آتا تھا اور زیادہ تر نیلما کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے زبیر کے تعاون سے نیلما کو افیون کی لعنت سے نجات دلائی ہے۔ جس کا ثبوت اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ یہ اب بچی نہیں رہی۔ جوان عورت بن چکی ہے اور اب ماں بننے والی ہے۔''

عدالت میں چند لمحوں کے لئے سناٹا چھا گیا۔ سب نیلما کو تک رہے تھے۔ پھر وکیل صفائی نے کہا۔ ''جنابِ عالی! یہ عجیب بات ہے کہ ہم مقتول غازی جمال الدین کے کیس پر بحث کرنے آتے ہیں لیکن تان نیلما کے حوالے سے دوسرے موضوعات پر ٹوٹتی ہے۔ آج تک مقتول جمال الدین کے قاتل کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ہمارے فاضل سرکاری وکیل، پولیس اور انٹیلی جنس والے اس کیس کے ضمنی حالات پیش کر رہے ہیں اور کیس کے اصل مقصد کو عدالت کی نظروں سے اوجھل کرتے جا رہے ہیں۔''

وکیل صفائی نے نیلما کو اس کیس سے بری کرنے اور ہسپتال سے چھٹی دلانے کی انتہائی کوششیں کیں جس پر عدالت سے حکم جاری ہوا۔ ''چونکہ نیلما ماں بننے والی ہے، یہ پانچواں مہینہ گزر رہا ہے لہٰذا اسے اپنے گھر کا ماحول ملنا چاہئے۔ ڈاکٹر رضوانہ کو اس سے ملنے

کی پوری آزادی ہوگی، وہ علاج کے سلسلے میں جب چاہے ملاقات کر سکے گی لیکن اب یہ اپنے شوہر زبیر کے ساتھ رہے گی۔''

عدالت کے باہر چنگیزی نے رضوانہ سے کہا۔''تم نے خوب چال چلی ہے۔ مجھے اُلو بناتی رہیں لیکن اس کا انجام جانتی ہو؟''

''انجام کی تم فکر کرو۔ تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو کسی نجومی کے پاس جاؤ یا طوطا فال کھلواؤ، وہ شاید بتا سکیں کہ تمہاری زندگی کی لکیر مٹتی جا رہی ہے۔''

جواب میں چنگیزی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہونٹوں کو بھینچ کر چپ رہا، اس کی بیوی عاصمہ آ رہی تھی۔ عاصمہ نے قریب آتے ہی غصے سے کہا۔''رضوانہ! تم اپنی دانست میں بہت چالاک ہو۔ تم نے میرے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ نیلما میری بہو نہیں بن سکی۔ زبیر کے بچے کی ماں بن رہی ہے لیکن یہ دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔''

''تم بہت غصے میں ہو، ابھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی، میں جو کر رہی ہوں، وہ تمہارے شوہر چنگیزی کے اشارے پر کر رہی ہوں، یقین نہ آئے تو ذرا ان تصویروں کو دیکھ لو۔''

اس نے اپنے پرس میں سے دو تصویریں نکال کر دکھائیں۔ عاصمہ انہیں دیکھتے ہی چونک گئی۔ رضوانہ اور چنگیزی رومانی حالت میں نظر آ رہے تھے۔ اس نے کہا۔''یہ تو کچھ نہیں ہے۔ میرے گھر آؤ گی تو اس سے بھی اہم انکشافات کروں گی۔''

چنگیزی نے بھی وہ تصویریں دیکھ لی تھیں اور سمجھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بڑی شرمناک و قابلِ اعتراض تصویریں اتاری گئی تھیں۔ ان تصویروں کا ایک سیٹ رضوانہ کو بلیک میل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اب وہ بے شرم بن کر تمام تصویریں عاصمہ کو دکھائے گی تو وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سوسائٹی میں ایک معزز ڈاکٹر کی حیثیت سے عزت بنانے والی اور شہرت حاصل کرنے والی عورت اس کی بیوی کے سامنے یوں اپنے آپ کو عریاں کر سکتی ہے۔ اس نے دانت پیستے ہوئے رضوانہ کو دیکھا، پھر کہا۔''عاصمہ! یہ فراڈ ہے، یہ میرے اور تمہارے درمیان اختلافات پیدا کر کے ہمارے راز اگلوانا چاہتی ہے۔ اتنا ہنگامہ ہونے کے باوجود ابھی تک قاتل کا سراغ نہیں مل سکا، یہ ہمیں قاتل ثابت کرنا چاہتی ہے، اس سے ہوشیار رہو۔''

رضوانہ نے کہا۔''تمہیں اپنے شوہر کی ہدایات پر عمل کرنا چاہئے اور ہمہ وقت ہوشیار

رہنا چاہئے لیکن ذرا ایک طرف چل کر میری بات سن لو۔''

چنگیزی نے کہا۔''ہرگز نہیں، عاصمہ، اس کے ساتھ نہ جاؤ، یہ تمہیں بہکائے گی۔''

''میں کوئی نادان بچی نہیں ہوں۔ اس تصویر کو دیکھ کر بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ میں ضرور سننا چاہوں گی کہ یہ تنہائی میں کیا کہنا چاہتی ہے۔'' وہ رضوانہ کے ساتھ چلتی ہوئی ذرا دور گئی، پھر پوچھا۔''بولو، کیا بات ہے؟''

''یہ دو تصویریں محض ایک نمونہ ہیں۔ اس سے آگے بھی کچھ دیکھنا چاہتی ہو، کچھ سننا چاہتی ہو، کچھ سمجھنا چاہتی ہو تو میرے پاس تصویریں بھی ہیں اور ایسے کیسٹ بھی، جن سے تمہارے شوہر کی اصلیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ جانے لگی پھر کچھ سوچ کر رک گئی، پاس آ کر بولی۔''چنگیزی یہ صفائی پیش کرے کہ میں آوارہ اور بدچلن ہوں تو اس سے میری بدچلنی کا ثبوت ضرور طلب کرنا۔''

وہ چلی گئی۔ چنگیزی نے عاصمہ کے پاس آ کر پوچھا۔''وہ کیا کہہ رہی تھی؟''

عاصمہ نے اسے نفرت اور حقارت سے غرا کر دیکھا۔ پھر تنتناتی ہوئی اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ چنگیزی نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔''دیکھو عاصمہ! ہم برسوں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرتے آ رہے ہیں۔ تمہیں دشمن سے محتاط رہنا چاہئے۔''

''میں ضرور محتاط رہوں گی۔ دشمن نے ثبوت کے طور پر دو تصویریں پیش کی ہیں، کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ رضوانہ ایک بدچلن عورت ہے؟''

''وہ بدچلن نہ ہوتی تو اس تصویر میں میرے ساتھ کیوں نظر آتی؟''

''شاید اس لئے کہ تم سے اس کا پرانا رشتہ ہے۔ آخر تم اس کے کزن ہو۔''

''یہ غلط ہے۔ وہ ایک فلرٹ قسم کی عورت ہے۔ بہت ہی عیاش ہے، اسی لئے آج تک شادی نہیں کی۔''

''اگر عیاش ہے تو کسی اور کے ساتھ اس کی تصویر کیوں نہیں ہے؟''

چنگیزی چپ ہو گیا۔ سوچتا رہ گیا کہ اس ماہر نفسیات رضوانہ نے کیسی چال چلی ہے۔ قانون کے محافظ اسے قاتل ثابت نہ کر سکے لیکن وہ اسے بیوی کی نظروں میں بدچلن، آوارہ اور ناقابلِ اعتماد ثابت کرتی جا رہی ہے۔

چنگیزی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ اگرچہ وہ رضوانہ کو بچپن سے جانتا تھا۔ جوانی میں بھی

سائیکاٹرسٹ کی حیثیت سے واقف تھا لیکن آج سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ نفسیاتی کھیل کھیل رہی ہے۔ ہوسکتا ہے، اسی طرح عدالت میں ایک دن اسے قاتل ثابت کردے۔ لہٰذا اس سے پہلے ہی اس کا قصہ تمام کردینا چاہئے۔

☆======☆======☆

دوسری طرف رضوانہ نے کہا۔ ''زبیر! میں نے اپنے متعلق بہت کچھ چھپایا ہے۔ تمہیں شکوک وشبہات میں مبتلا کیا ہے۔ اب بھی مبتلا کررہی ہوں۔ فی الحال میری ایک بات مانو، میری حفاظت کے انتظامات کرو۔ مجھ پر قاتلانہ حملے ہوسکتے ہیں۔''

زبیر سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر رضوانہ بہت گہری عورت ہے، اگر اس سے سوالات کئے جائیں گے تو وہ صحیح جواب نہیں دے گی۔ لہٰذا اس نے چپ چاپ اس کی حفاظت کے انتظامات کردیئے۔

☆======☆======☆

دوسری طرف چنگیزی، عاصمہ کے ساتھ کار میں بیٹھا گھر کی طرف جارہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ ''رضوانہ نے کیا کہا ہے؟''

''جو کہا ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔ زیادہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اتنا بتادو، اس تصویر میں تم رضوانہ کے ساتھ کیوں نظر آرہے ہو؟''

''میں نے اسے اغوا کیا تھا۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لئے، تمہارے ایک نقص کو راز رکھنے کے لئے اسے بلیک میل کرنا لازمی تھا۔ اس لئے میں نے ایسی تصویریں اتروائی ہیں۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو، صرف تصویریں اتاری گئی ہیں۔ تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ تم تو کہہ رہے تھے، تمہارے چار غنڈوں نے اس کے ساتھ ایسی حرکتیں کی ہیں جس کے بعد وہ سر اٹھا کر نہیں چل سکے گی اور نہ ہی ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھا سکے گی، یہاں تو چار میں سے کسی ایک غنڈے کی بھی تصویر نہیں ہے۔ صرف تمہی ایک غنڈے نظر آرہے ہو۔''

''پلیز عاصمہ، سمجھنے کی کوشش کرو، وہ چالیں چل رہی ہے۔ ہمارے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ ہمارا گھر تباہ کرنا چاہتی ہے اور تم اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہو بلکہ..........''

''بکواس مت کرو۔ اگر وہ دشمن ہے تو یہ دو تصویریں کیا میری دوست ہیں؟ کوئی بھی بیاہتا عورت ایسی تصویریں برداشت کرسکتی ہے؟''

''صاف اور سیدھی بات کہہ دوں تو مجھے معاف کردو گی؟''

''میں وہ سیدھی بات معلوم کرنا چاہوں گی۔''

''میں سچ کہتا ہوں، اسے اغوا کرنے کے بعد تنہائی میں بہک گیا تھا۔ اس لئے ایسی غلطی ہوگئی۔''

''اسے اغوا کرنے والے تمہارے غنڈے تھے، پھر انہوں نے تمہاری تصویریں کیوں اتاریں۔ اپنی تصویریں کیوں نہیں اتروائیں۔ کیا اس کے ساتھ تمہارے کسی غنڈے کی تصویر ہے؟ کیا تم کوئی ثبوت پیش کرسکتے ہو؟''

وہ چپ رہا۔ اس نے رضوانہ پر کسی غنڈے کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا تھا۔ کچھ بھی ہو، وہ پچیس برس پہلے کی جائیداد تھی اور جائیداد جتنی پرانی ہوتی ہے، اتنی ہی اس کی محبت بھی بڑھتی ہے، قیمت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ شراب اور شباب سے کھیلنے کے دوران عقل رہتی ہے مگر ذہانت نہیں رہتی۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ جوانی کی سلور جوبلی مناتے وقت بھول گیا تھا کہ وہ نفسیات کی ماہر ایسی گہری چالیں بھی چل سکتی ہے جن سے آپس میں پھوٹ پیدا ہوسکتی ہے۔ وہ، عاصمہ اور ان کا بیٹا ارباب چنگیزی تینوں ہی ایک دوسرے کے راز دار تھے۔ جب تک ان میں سے کسی کی زبان نہ کھلتی، غازی جمال الدین کے قاتل کا نام ظاہر نہ ہوتا۔ چنگیزی کو یہ فکر لاحق تھی کہ رضوانہ کہیں عاصمہ کی نفسیاتی کمزوریوں سے کھیلتے ہوئے قاتل کو بے نقاب نہ کردے۔

عاصمہ نے پوچھا۔ ''تم چپ کیوں ہوگئے۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟''

''جواب کیا دے سکتا ہوں؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، رضوانہ ایک بازاری عورت کی طرح میری زندگی میں آئے گی اور میرے خلاف تمہارے دل میں زہر بھر دے گی۔ میں صرف اتنا کہوں گا۔ ایک بہت بڑا راز ہمارے سینوں میں دفن ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے خلاف ہوگا یا دشمنی پر اتر آئے گا تو سب ہی پھنسیں گے۔ یہ نہ سمجھنا کہ صرف گولی چلانے والا قاتل ہوتا ہے، اس کے ساتھ سازش میں شریک ہونے والے بھی مجرم کہلاتے ہیں۔ سبھی کو سزا ہوتی ہے۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم لیکن سزا ضرور ہوتی ہے۔ اس طرح ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔''

عاصمہ نے اسے دانت پیستے ہوئے دیکھا، پھر کہا۔ ''یہی سوچ کر خاموش ہوں۔ پہلی

بار تم نے ڈیڈی کو قتل کرنے کا مشورہ دیا جبھی میرا دل دھڑک گیا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے میں اپنے آپ کو مارنے کی سازش میں شریک ہوں۔ یہ دولت بری بلا ہے اور اس سے بھی بری بلا اولاد کی محبت ہے۔ میں نے جو کچھ تمہارے ساتھ مل کر کیا، اپنی اولاد کی محبت میں کیا۔ یہ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا، جو شخص میرے باپ کو قتل کر سکتا ہے، وہ میرا وفادار کب تک رہے گا۔ مجھے رضوانہ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اس نے میری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔''

''مجھے صاف صاف بتاؤ۔ تمہارے ارادے کیا ہیں؟''

''کچھ نہیں، ہمیں صبر کرنا ہوگا۔ سوسائٹی میں ہمارا اونچا مقام ہے، ہمیں اس کے سامنے میاں بیوی ہونے کا بھرم رکھنا ہوگا لیکن آج سے تم میرے بیڈ روم میں نہیں آؤ گے۔ ہمارا میاں بیوی کا رشتہ ختم سمجھو۔''

''بیڈ روم کا رشتہ بہت ہی کمزور ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی ٹوٹ جاتا ہے لیکن ہم اپنی اولاد کی محبتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ بندھن کبھی ٹوٹ نہیں سکے گا۔ بہر حال میں تمہارے دل سے میل دور کرنے کی کوشش کروں گا۔''

☆======☆======☆

عاصمہ اضطراب میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اسے گھر پہنچ کر بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ آخر وہ شام کو رضوانہ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ اسے صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر بولی۔ ''کبھی ہم ایک دوسرے کی بڑی راز دار سہیلیاں تھیں۔ آج ایک دوسرے کی سوکن بن کر مل رہی ہیں۔''

عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔ ''سوکن؟''

''ہاں، جو بات کل کھلنے والی ہے، وہ آج کھل جائے تو کیا ہرج ہے۔ اسی لئے میں نے عدالت میں کہا تھا، تم مجھ سے ملنا چاہو تو گھر چلی آنا۔ اچھا ہوا آ گئیں؟''

عاصمہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی، پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے میرے شوہر سے نکاح کر لیا ہے؟''

''بیشک۔''

''کیا تمہارے پاس ثبوت ہے؟''

''دو دن بعد نکاح نامے کے کاغذات مل جائیں گے۔ انہیں دیکھ لینا۔''

''میں یہ ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں چنگیزی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ایک نہایت ہی لالچی شخص ہے۔ میرے باپ کی بے انتہا دولت کو چھوڑ کر تم سے نکاح نہیں کرے گا۔ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی نہیں مارے گا۔''

رضوانہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں گئی۔ پھر کیسٹ ریکارڈر لے آئی۔ اس کے سامنے رکھ کر آن کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس میں سے رضوانہ اور چنگیزی کی گفتگو سنائی دینے لگی۔ وہ گفتگو ایسی تھی جسے کوئی بیوی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنگیزی صاف لفظوں میں کہہ رہا تھا کہ عاصمہ کباڑیے کی دکان میں رکھا ہوا ایک زنگ آلود سامان ہے اور رضوانہ کے حسن و شباب کی تعریفیں کرتا جا رہا تھا۔ عاصمہ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے۔ ہم نے جس دن نکاح پڑھوایا، وہ رات یہاں کے ایک ہوٹل میں گزاری۔ اس ہوٹل میں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی، اسے بھی سن لو۔''

ہوٹل کے کمرے میں رات گزارنے کے دوران جو گفتگو ہوتی رہی، عاصمہ اسے پوری طرح سن نہ سکی۔ اس نے لپک کر ریکارڈر کو اٹھایا۔ پھر اسے میز پر دے مارا۔ رضوانہ نے کہا۔ ''میرے سامنے غصہ دکھا کر کیا کرو گی۔ ابھی تو میں اس سوال کا جواب دوں گی کہ چنگیزی نے تمہاری بے انتہا دولت کو چھوڑ کر مجھ سے کیوں نکاح پڑھایا۔ میری بوڑھی سہیلی عاصمہ! تم بہت نادان ہو، اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ عورت بڑھاپے تک شادی نہ کرے تب بھی کنواری کہلاتی ہے اور اس میں بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ ذرا گھر جا کر حساب کرو کہ چنگیزی نے تمہاری دولت کا کتنا حصہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کرایا ہے۔''

وہ غصے میں تنتناتی ہوئی باہر آئی۔ اپنی کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ پھر تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی بنگلے کے احاطے سے نکل گئی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ جب کسی خوشحال دولت مند کو یہ معلوم ہو کہ وہ اچانک لٹ گیا ہے تو صدمہ برداشت نہیں ہوتا اور وہ تو کئی پہلوؤں سے لٹ گئی تھی۔ ایک تو شوہر کی باتوں میں آ کر اپنے باپ کو قتل کرا دیا۔ وہ باپ کی تمام دولت حاصل کرنا چاہتی تھی اور چنگیزی اس دولت کا حصہ اس کی سوکن کو پہنچا رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ جس شوہر پر اعتماد کر کے ایک بھیانک جرم کی مرتکب ہوئی، وہ اپنا نہیں تھا۔ ہمیشہ سے دھوکا دیتا آ رہا تھا۔ آخری بات یہ کہ وہ خود کو دھوکا دیتی

رہی تھی۔ اس کے جسم میں جو کمی تھی، وہ اسے مصنوعی طریقوں سے پورا نہ کرتی تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اپنے عیب کو چھپانے کے لئے اس نے دوسرے عیبی سے دوستی کی پھر شادی کی اور اسی کے نتیجے میں آج وہ خالی ہوگئی تھی، دولت ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ شوہر ہاتھ سے نکل چکا تھا اور بدن کی کھوکھلی نمائش نے اسے بالکل ہی کھوکھلا بنا کر چھوڑ دیا تھا۔

وہ گھر پہنچی تو نادرہ نے رات کے کھانے کے لئے پوچھا۔ اس نے بیٹی کو جھڑک دیا۔ غصے سے چلتی ہوئی بیڈروم میں آئی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے؟ بس ایک ہی خواہش تھی، کسی طرح چنگیزی کو اپنی زندگی سے نوچ کر پھینک دے۔ آخر اس نے اپنی زندگی میں اسے آنے ہی کیوں دیا؟

تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس کی کھوکھلی نمائش نے اس کے لئے راستے ہموار کئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر سوچا۔ اگر میں اپنے جسم کی ایک کمی پوری کرنے کے لئے رضوانہ کو رازدار نہ بناتی۔ اگر میں بنکاک نہ جاتی تو کیا فرق پڑتا۔ کسی تیسرے کو یہ بات معلوم نہ ہوتی بلکہ کسی کو معلوم نہ ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ شادی ہی نہ کرتی، اگر کرتی تو شوہر کو ساری عمر رازدار بنا کر رکھتی۔

وہ ادھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ بے چینی اسے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ اس نے سوچا۔ اس میں کسی کا قصور نہیں ہے۔ صرف اپنا قصور ہے۔ میں نمائش چاہتی تھی۔ میں تمکنت سے چلنا چاہتی تھی۔ دولت کے غرور میں پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ایک کمی بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اسے میں نے پورا کرلیا اور آج اس کا نتیجہ سامنے آرہا ہے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی آئی اور پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی۔ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ ''مجھے کیا ہوگیا تھا؟ اب بھی مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میری جیسی دولت مند عورتیں بڑھاپے میں بھی نمائش کیوں چاہتی ہیں؟ کیوں اکڑ اکڑ کر چلتی ہیں؟ کیوں شرافت اور تہذیب کو بھول کر جھوٹی نمائشوں میں آخری سانس تک مبتلا رہتی ہیں؟''

آدھی رات کو دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے غصے سے کہا ''چلے جاؤ، میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔''

اپنے جوان بیٹے کی آواز سنائی دی۔ ''ممی، میں ہوں آپ کا ارباب!'' اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ارباب نے کمرے میں آتے ہی پوچھا۔ ''کیا آپ بہت

زیادہ پریشان ہیں؟ نادرہ کہہ رہی تھی، آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے؟''

اس نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ پھر بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے کے پاس لائی۔ وہاں بٹھا کر بولی۔ ''آج میں بہت پریشان ہوں، ہوسکتا ہے، صبح تک مرجاؤں۔''

''مریں آپ کے دشمن۔ آپ مجھے صاف صاف بتائیں، کیا بات ہے۔ اگر جوان بیٹا آپ کے سامنے ڈھال نہ بن سکا تو پھر مجھے بیٹا کہلانے کا حق نہیں ہے۔''

''خوش رہو بیٹے، مجھے صرف تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم مجھے اتنا بتا دو، کسے زیادہ چاہتے ہو، مجھ کو یا اپنے ڈیڈی کو؟''

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اپنی ماں کو دونوں بازوؤں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا۔ پھر اس کے قدموں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ میری آئیڈیل ہیں۔ میں آپ کو کتنا چاہتا ہوں، یہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ہاں، ڈیڈی کو صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے شوہر ہیں۔ ورنہ میں............ ورنہ میں............''

''ہاں، ہاں، بولو بیٹے، تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

''ممی، آپ برا نہ مانیں، مجھے آپ کے شوہر سے سخت نفرت ہے۔ انہیں باپ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''آخر بات کیا ہے؟''

''بات ایک ہو تو بتاؤں، یہ سوچ کر صبر کرلیتا ہوں، آخر باپ ہیں، جتنی بھی ہیرا پھیری کریں گے، دھوکا دیں گے، وہ سب میرے ہی کام آئے گا اور تو ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔''

''بیٹے! اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔ انہوں نے دوسری شادی کرلی ہے۔ دوسری اولاد ہوسکتی ہے اور وہ ہماری دولت کا بہت سا حصہ میری سوکن کے اکاؤنٹ میں جمع کرتے جا رہے ہیں۔''

''کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟''

''کیا ماں تم سے جھوٹ بول سکتی ہے؟''

''پھر تو میں اس شخص کو کبھی معاف نہیں کروں گا جو آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔''

عاصمہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے ماں کے ہاتھوں کو ہٹاتے

ہوئے آنسو پوچھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں بیوقوف عورت ہوں۔ میں نے اس شخص کے فریب میں آ کر باپ کو قتل کرا دیا۔''

''ممی، چپ ہو جائیے۔ میں جسے باپ کہتا ہوں، اس نے بڑے گھناؤنے جرائم کئے ہیں۔ ہم سب کو دھوکا دیا ہے۔ ہم سب کو تباہ کیا ہے۔ جب بات اس حد تک کھل گئی ہے تو میں بتاؤں کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟''

اس نے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''میں ایک لڑکی کو چاہتا تھا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔''

''مگر بیٹے! میں تو تمہاری شادی نیلما سے کرنا چاہتی تھی۔''

''میں نے سوچا، دولت کے لئے نیلما سے شادی کروں گا لیکن اس حسینہ کو ضرور اپنا بناؤں گا۔ جس طرح میں نے کتنی ہی لڑکیوں کو گرل فرینڈ بنایا، اسی طرح اسے بھی بنانے کی کوشش کی لیکن پتا چلا، ڈیڈی درمیان میں آ گئے ہیں۔''

عاصمہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''ممی! آپ حیران کیوں ہیں، جو شخص میرے نانا کو قتل کر سکتا ہے۔ جو شخص آپ جیسی وفادار بیوی کو دھوکا دے سکتا ہے، جو ہماری دولت کو دوسری عورت کے ہاتھوں میں پہنچا سکتا ہے، وہ اور کیا نہیں کر سکتا۔ جب میں نے اس لڑکی سے چار دن بعد ملاقات کی تو اس نے میری طرف دکھا اور مجھ پر تھوک دیا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نے اس کا تھوکنا برداشت کر لیا؟''

''اور کیا کرتا۔ میرے باپ نے اسے اغوا کیا تھا اور اسے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ جس دن وہ مجھ پر تھوک کر گئی، اسی رات سیلنگ فین سے رسی باندھ کر پھندے سے لٹک گئی۔''

عاصمہ نے شدید نفرت سے کہا۔ ''یہ شخص میرا حق تو مار ہی رہا ہے، میرے بیٹے کا حق بھی مار چکا ہے۔''

''ممی! تب سے میرے دماغ میں ایک ہی بات نقش ہو گئی ہے کہ جو میری گرل فرینڈ کو اغوا کر سکتا ہے، وہ مجھ سے میرے نانا کی دولت اور جائیداد بھی چھین سکتا ہے۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے میں تلملاتی ہوئی بولی۔ ''مجھے ابھی ٹیلی سکوپ والی رائفل لا کر دو۔ میں اسے گولی مار دوں گی۔''

''رائفل لا دوں گا لیکن آپ وعدہ کریں، میری باتوں پر عمل کریں گی، جو کہوں گا وہی کرتی جائیں گی۔''

اس نے قریب آ کر بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میرا اس دنیا میں تمہارے سوا اور کون ہے۔ ایک بیٹی ہے جو کسی دن رخصت ہو جائے گی۔ میں تمہارے ہی سہارے جی رہی ہوں اور میرے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ سب تمہارا ہے۔''

''تو پھر آیئے، بیٹے پر بھروسا کیجئے اور میرے ساتھ چل کر کھانا کھایئے۔'' وہ ماں کو سمجھا بجھا کر کمرے سے لے گیا۔ دوسرے دن اس نے گیارہ بجے ٹیلی فون پر ماں سے رابطہ قائم کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ فوراً ضروری سامان پیک کر لیں، ہمیں دوپہر کی فلائٹ سے ملتان جانا ہے۔''

عاصمہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ اچانک تمہیں ملتان کی کیا سوجھی ہے؟''

''آپ نے وعدہ کیا ہے جو کہوں گا، وہ کرتی جائیں گی، لہٰذا فوراً تیار ہو جائیں۔''

بیٹے کا محبت بھرا حکم سن کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پلنگ کے نیچے سے اٹیچی نکال کر اوپر رکھی پھر الماری کھول کر ضروری کپڑے نکالنے لگی۔ چنگیزی نے دروازے پر آ کر کہا۔ ''تم نے مجھ پر پابندی عائد کی ہے۔ میں تمہارے بیڈ روم میں نہیں آ سکتا لیکن پوچھ سکتا ہوں، یہ کہاں کی تیاری ہے؟''

''میں اپنے بیٹے کے ساتھ ملتان جا رہی ہوں۔''

''تعجب ہے، اس موسم میں جا رہی ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں، ملتان میں کتنی شدید گرمی پڑتی ہے؟''

''میں تمہاری صورت نہ دیکھنے کے لئے جہنم میں بھی جا سکتی ہوں۔ کیا ملتان میں انسان نہیں رہتے؟ کیا ہمارے باپ دادا اس شہر میں نہیں رہتے تھے۔ میری نظروں کے سامنے سے چلے جاؤ۔ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔''

اس نے بھی غصے اور کچھ پریشانی سے عاصمہ کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد ارباب کوٹھی میں آیا اور اپنی ماں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ چنگیزی دور ہی

دور سے ماں بیٹے کو دیکھتا رہا۔ کچھ پریشان ہوتا رہا۔ پھر اس نے ڈرائنگ روم میں آ کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہوتے ہی کہا۔ ''رضوانہ! تم بڑی گہری چالیں چل رہی ہو لیکن یہ چالیں مہنگی پڑیں گی۔''

''مجھے یا تمہیں؟'' رضوانہ نے پوچھا۔ ''آخر بات کیا ہے، بہت غصے میں لگتے ہو؟''

''عاصمہ اپنے بیٹے کے ساتھ ملتان گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نے اچانک ملتان کا ارادہ کیوں کیا ہے؟''

''اس میں پریشانی یا غصے کی کیا بات ہے؟''

''اس نے کل سے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ تم جس طرح اسے بہکا رہی ہو وہ بہک رہی ہے اور مجھے باتیں سنا رہی ہے۔ اس کے بیڈ روم میں میرا داخلہ ممنوع ہو چکا ہے۔ لہٰذا آج ہم کسی ہوٹل میں ملاقات کریں گے۔''

رضوانہ نے کہا۔ ''ذلیل انسان، کیا تم مجھے بازاری عورت سمجھتے ہو؟''

''کیا اس سے پہلے تم نے میرے ساتھ رات نہیں گزاری؟''

''مجھے میرے حالات مجبور کر رہے تھے، میں نے وہ کیا جو میرے مزاج کے خلاف تھا۔ جو میری شرم اور میری غیرت کے خلاف تھا لیکن اب مجبور نہیں ہوں۔ اگر تم ان شرمناک تصاویر کی پبلسٹی کرو گے تو تمہیں عاصمہ کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ٹھنڈے دماغ سے غور کرو، جن تصاویر کو میری کمزوری بنا رہے تھے، اب وہ تمہاری کمزوری بن چکی ہیں۔ تم مجبور ہو لہٰذا عاصمہ کے ڈر سے انہیں منظرِ عام پر نہیں لاسکو گے۔''

''تم بہت ہی ذلیل عورت ہو۔''

''جب عورت غالب آنے لگتی ہے تو مردوں کی لغت میں ذلیل کہلانے لگتی ہے، چنگیزی! تم نے اغوا ہونے والی عورتوں کو روتے سسکتے اور ہار مانتے دیکھا، میرے ہار ماننے پر تم دھوکا کھا گئے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں، جب تک عورت روتی ہے اور آنسوؤں کا ہتھیار استعمال کرتی ہے، اس وقت تک ہارتی چلی جاتی ہے۔ جب اپنی جوانی کا پانسا پھینکتی ہے تو مرد اپنے تن کا آخری کپڑا بھی ہار جاتا ہے اور تم بھی ہار چکے ہو چنگیزی۔''

رضوانہ نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے رابطہ قائم ہونے کے بعد کہا۔ ''زبیر! میں ضروری اطلاع فراہم کر رہی

ہوں۔ ذرا چوکنے رہو۔ عاصمہ اپنے بیٹے ارباب چنگیزی کے ساتھ ملتان جا رہی ہے۔ تم ابھی معلوم کرو، وہ کس فلائٹ سے جا رہی ہے؟''

''ڈاکٹر رضوانہ! میری سمجھ میں نہیں آیا، یہ اطلاع ضروری کیسے ہو گئی۔ وہاں اس کے آباؤ اجداد کی زمینیں ہیں۔ اس کے مکانات ہیں، وہ کسی وقت بھی جا سکتی ہے۔''

''زبیر! تم نے یقیناً انٹیلی جنس بیورو کے ٹریننگ سینٹر میں تربیت حاصل کی ہے لیکن ابھی کچے ہو۔ ہر پہلو پر نظر نہیں رکھ سکتے۔''

''آپ میری بزرگ ہیں۔ آپ ہی مجھے کچھ سمجھائیں۔''

''تم جانتے ہو، ملتان میں ان دنوں کتنی شدید گرمی پڑتی ہے۔ لوگ مری اور سوات جاتے ہیں، جبکہ عاصمہ بیٹے کو لے کر ملتان جا رہی ہے۔ کیا یہ بات چونکا دینے کے لئے کافی نہیں ہے؟''

''اوہ ڈاکٹر! آپ نے واقعی چونکا دیا ہے۔ یہ بات واقعی قابلِ غور ہے، میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔''

رضوانہ نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگی۔ اس کا دماغ بہت تیزی سے بہت کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ جانے کیا سوچتا جا رہا تھا؟

عاصمہ کے چلے جانے سے چنگیزی ذرا پریشان ہوا تھا، مگر اطمینان بھی ہوا تھا، وہ سوچ رہا تھا، کچھ روز الگ رہ کر شوہر کی کمی محسوس کرے گی پھر اس کا غصہ کم ہو گا، وہ خود ہی واپس آ جائے گی لیکن وہ دوسرے دن عاصمہ کو کوٹھی میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا ''تم کب آئیں؟''

''آج پانچ بجے صبح یہاں پہنچی ہوں۔''

وہ سیون ایم ایم کی ایک رائفل کو کپڑے سے صاف کر رہی تھی۔ چنگیزی نے پوچھا۔ ''یہ کہاں سے لائی ہو۔ آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ہماری دنیا میں کوئی چیز غیر ضروری نہیں ہے۔ اگر غیر ضروری ہوتی تو وہ پیدا ہی نہ کی جاتی۔ خواہ اولاد ہو یا اسلحہ۔''

اس نے تشویش بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ پھر دوسرے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ اپنا بریف کیس اٹھایا۔ اس کے بعد باہر جانے لگا۔ عاصمہ نے پوچھا۔ ''کہاں جا

رہے ہو؟''

''ایک ٹھیکیدار سے ضروری اپائنٹمنٹ ہے۔''

''میں اس سے بھی زیادہ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''تو پھر کرو۔''

''یہاں نہیں، اُدھر باغیچے میں چلو۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں غازی جمال الدین کو قتل کیا گیا تھا۔ چنگیزی نے وہاں پہنچ کر پوچھا۔ ''تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو۔ کون سی ضروری بات کرنی چاہتی ہو؟''

وہ ذرا دور ہوگئی، پھر ایک جھاڑی کے اندر سے کھلونا رائفل کو نکال کر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں گولی مارنا چاہتی ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''کیا دماغ چل گیا ہے؟ نیلما کی طرح نادان بچی بن گئی ہو، اس کھلونا رائفل سے مارو گی؟''

وہ بولی۔ ''میرے سرتاج آپ فرمائیں گے، کاغذ کی ناؤ ڈوب جاتی ہے، شاید ڈوب جاتی ہو۔ آپ دعویٰ کریں گے، خوشبو آنہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔ شاید خوشبو نہ آتی ہو لیکن آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ کھلونا رائفل سے گولی چل سکتی ہے۔ آدمی مر سکتا ہے اور بے شک وشبہ مر سکتا ہے۔''

وہ کہتی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے کوئی چھپا ہوا ٹیلی اسکوپ ٹارگٹ لینس سے دیکھ رہا تھا۔ ٹارگٹ لینس کے کراس پوائنٹ پر چنگیزی کی پیشانی واضح تھی۔ نشانہ چوک نہیں سکتا تھا۔ اسی وقت عاصمہ نے کھلونا رائفل کے ٹرائیگر کو دباتے ہوئے ٹھائیں کی آواز نکالی۔ اس کے ساتھ ہی گولی چنگیزی کی پیشانی میں پیوست ہوئی اور خون کی دھار بہنے لگی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ دھپ کی آواز کے ساتھ ہری بھری گھاس پر اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کی لاش کے پاس پہلے کھلونا رائفل آ کر گری، پھر ایک سیون ایم ایم کی رائفل آ کر گر پڑی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

چار گھنٹے بعد ایک طیارہ ماں بیٹے کو کراچی سے ملتان کی طرف لے جا رہا تھا۔ تمام مسافر پُرسکون ماحول میں سفر کر رہے تھے۔ ماں بیٹے کو بھی سکون مل گیا تھا۔ ان کا وہ دشمن جو

برسوں سے دوست بن رہا تھا، ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔ اب کوئی ماں بیٹے سے فراڈ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی ان کی جائیداد کا ایک ذرا سا حصہ اس کی سوکن تک نہیں پہنچا سکتا تھا اور نہ ہی ارباب چنگیزی کے نانا کی دولت اس سے چھین سکتا تھا۔ ہر طرف سے اطمینان اور سکون تھا۔ وہ کراچی سے لاہور پہنچے۔ وہاں سے اپنی کار میں بیٹھ کر ملتان کا سفر کیا۔ تمام راستے ماں بیٹے ہنستے بولتے رہے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اب تک ان کے سر پر ایک پہاڑ رکھا ہوا تھا جو بڑی آسانی سے ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑا تھا اور وہ ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ تقریباً ساڑھے چار گھنٹے بعد وہ ملتان پہنچے اور اپنے محلے میں داخل ہوئے مگر پولیس پارٹی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سپاہیوں کے ساتھ محلے والے بھی نظر آ رہے تھے۔ ان میں زبیر بھی تھا۔ اس نے کار کے قریب آ کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''ارباب چنگیزی خود کو قانون کے حوالے کر دو۔''

زبیر نے عاصمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں حیرانی ہوگی، میں یہاں صبح سویرے پہنچ چکا تھا۔ اگر چاہتا تو کراچی ائیرپورٹ پر گرفتار کروا سکتا تھا مگر یہاں تمہارے ہی محلے والوں کی گواہی ضروری تھی کہ تم ابھی کار کے ذریعے یہاں پہنچی ہو۔''

عاصمہ نے کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کے ساتھ تفریح کے لئے گئی تھی، کراچی نہیں گئی تھی۔''

ہمارے پاس ثبوت ہے۔ جب تم کراچی ائیرپورٹ سے یہاں آ رہی تھیں تو مختلف مقامات پر تمہاری اور تمہارے بیٹے کی تصویریں اتاری گئی ہیں۔ کراچی سے لے کر لاہور تک چیکنگ کرنے والے افسران اس بات کے گواہ ہیں کہ تم ماں بیٹے نے آج کراچی سے سفر شروع کیا ہے، خواہ اس سفر کا اختتام کہیں پر ہو لیکن آج ایک بجے دن تک کراچی میں تم ماں بیٹے کی موجودگی ثابت ہو جاتی ہے۔''

ماں بیٹے گم صم سے رہ گئے۔ زبیر کہہ رہا تھا۔ ''نیلما میرے بچے کی ماں بننے والی ہے، وہ بڑی حد تک نارمل ہو گئی ہے۔ وہ عدالت میں بیان دے گی کہ اس کی آنٹی عاصمہ کس طرح اسے سینے سے لگا کر دودھ پلایا کرتی تھی اور منصف اعلیٰ اتنا نادان نہیں ہوتا کہ وہ پینتالیس برس کی ایسی عورت کو دودھ پلانے والی تسلیم کرے جس نے حال ہی میں کسی بچے کو جنم نہ دیا ہو۔''

زبیر نے پہلے عاصمہ کو دیکھا۔ پھر ارباب چنگیزی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ فرمائیں گے، دریا الٹا نہیں بہتا، شاید نہ بہتا ہو۔ آپ دعویٰ کریں گے، وقت خود کو نہیں دہراتا لیکن میں اسے تسلیم نہیں کروں گا کیونکہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جو عمل تم لوگوں نے غازی جمال الدین کے ساتھ کیا، وہی وقت نے تمہارے ساتھ دہرا دیا۔''

ماں بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔

☆======☆======☆

نصف کمتر

یہ جھوٹ ہے کہ مرد زر، زمین اور زن کے لئے لڑتا مرتا ہے۔
وہ صرف ہوس کے لئے لڑتا مرتا ہے۔
مرد بے شک مغرور ہے
مگر اپنی طلب کے پیچھے بھاگنے پر مجبور ہے۔

زنجیرِ عدل لرز رہی تھی۔ اوپر سے نیچے آ رہی تھی اور نیچے سے اوپر جا رہی تھی۔ کسی فریادی کی صدائیں حاکم کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ انہوں نے حکم دیا۔ ''فریادی سے کہو انتظار کرے۔ ہم ابھی اس سے انصاف کریں گے۔ پہلے محکمۂ نوآبادیات کے افسر کو پیش کیا جائے۔''

تھوڑی دیر بعد محکمۂ نوآبادیات کا افسر حاضرِ خدمت ہوا۔ پھر سلام کرنے کے بعد سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

حاکم نے سوال کیا۔ ''کیا ہماری رعایا کا کوئی فرد، رات کو بھوکا سوتا ہے؟''

''نہیں جناب عالی، بھوکا رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تاریخ کا سب سے درخشاں دور ہے۔ آج ہر گھر میں کلر ٹی وی ہے اور ہر دوسرے گھر میں وی سی آر موجود ہے۔ بھلا اتنی خوش حال رعایا تنگی اور بھوکی کیسے رہ سکتی ہے۔''

حاکم نے پوچھا۔ ''پھر زنجیرِ عدل کو کیوں چھیڑا جا رہا ہے۔ کوئی تو شکایت ہوگی کہ کوئی فریادی آیا ہے؟''

افسر نے سر جھکا کر کہا۔ ''فریادی ایک نہیں، بے شمار ہیں۔''

حاکم وقت نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''بے شمار؟''

''جی ہاں۔ دراصل وہ عورتوں کا مسئلہ..........''

انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''عورتوں کا مسئلہ؟ وہ تو حل ہو چکا ہے۔ مردانہ اور زنانہ بستیاں الگ الگ قائم ہو چکی ہیں۔ میاں بیوی کی ملاقاتوں کے لئے سرحد پر انتظام کر دیا گیا ہے، پروجیکٹ مکمل ہو چکا ہے۔ اب کیا رہ گیا؟''

''جناب عالی، وہ مسئلہ تو حل ہو چکا ہے لیکن اس سلسلے میں کچھ نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔''

''کیسے مسائل؟''

''جناب عالی، اگر ان فریادیوں کو حاضر ہونے کا حکم دیں تو انہیں دیکھتے ہی مسئلہ سمجھ میں آ جائے گا۔''

''انہیں حاضر کیا جائے۔''

حکم کی تعمیل کی گئی، دربارِ عام کا دروازہ کھولا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہائے ہائے کی بے شمار آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ آوازیں دروازے سے گزرتے ہوئے جب دربارِ عام میں داخل ہوئیں تو حاکم وقت نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ ان میں سے کوئی سینہ پیٹ رہا تھا یا پیٹ رہی تھی۔ کوئی تالی بجا رہا تھا یا بجا رہی تھی۔ کسی کے گلے میں ڈھولک لٹکی ہوئی تھی۔ کوئی اپنے دوپٹے سے منہ چھپا رہا تھا یا منہ چھپا رہی تھی۔ ایک نے تالی پیٹ کر کہا۔ ''اے حضور کے بچے جئیں۔''

دوسرے نے ڈھولک پر ایک تھاپ مار کر کہا۔ ''اے ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ حضور نے مردوں کو اِدھر کر دیا عورتوں کو اُدھر بھیج دیا۔ ہم کہاں جائیں؟''

حاکم نے گرج کر کہا۔ ''یہ کیا بکواس ہے۔ یہ کیسے فریادی ہیں۔'' آفیسر نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ ''حضور عالی، یہ خسرے ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ انہوں نے شاہی درباروں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ محلوں میں خواجہ سرا کہلاتے تھے اور آج گلیوں میں خسرے کہلاتے ہیں۔ ہمارے جسم کا کوئی حصہ بے حس یا بے کار ہو جائے تو ہم اسے کاٹ کر نہیں پھینک سکتے۔ اسی طرح یہ خسرے ایسا مفلوج کردار ہیں جنہیں ہم آج تک اپنی تہذیب سے کاٹ کر الگ نہ کر سکے۔''

''بات مختصر کی جائے، یہ کیا چاہتے ہیں؟''

ایک خسرے نے ذرا آگے بڑھ کر اپنا سراپا دکھاتے ہوئے، انگڑائی کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اے حضور، ہم سر سے پاؤں تک عورت ہیں۔ ہم زنانہ بستی میں رہنا چاہتی ہیں۔''

حاکم اعلیٰ نے سوالیہ نظروں سے آفیسر کی طرف دیکھا۔ آفیسر نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''حضور یہ قدرتی طور پر، پیدائشی مرد ہیں۔ انہیں مردانہ بستی میں رکھا جا رہا ہے۔''

ایک خسرے نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اور آفیسر کو کوستے ہوئے

کہا۔ ''موئے، تیرا خانہ خراب۔ ادھر عورتوں کو دور کر دیا۔ مردوں کے لئے انہیں پُرکشش بنا دیا۔''

دوسرے خسرے نے ڈھولک پر ایک تھاپ مارتے ہوئے کہا۔ ''دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ ہم بھی سہانی بننا چاہتی ہیں۔''

حاکم نے گرج کر کہا۔ ''بکواس مت کرو تم لوگوں کو مردانہ شہر میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حکم کی تعمیل کرو! جو تعمیل نہ کرے، اسے ملک بدر کیا جائے۔''

یہ حکم صادر کر کے حاکم وہاں سے رخصت ہو گیا۔ خسروں کی ڈھٹائی مشہور ہے۔ وہ دربار میں چیختے چلاتے رہے، سپاہی انہیں ہانک ہانک کر باہر نکالنے کی کوشش کرتے رہے، ایک خسرے نے باہر نکلتے نکلتے دروازے پر پہنچ کر کہا۔ ''اے ہم سے بھی ایک بات عقل کی سن لو، برائی کبھی برائی کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوتی۔ صرف محرومیاں، برائیوں کو جنم دیتی ہیں۔''

ان کے چیخنے چلانے اور فریاد کرنے کے باوجود ان کے مقدر میں مردانہ شہر لکھ دیا گیا۔

☆======☆======☆

طیارہ رن وے پر آ کر ٹھہر گیا۔ اس طیارے میں غیر ملکی اخباروں کے رپورٹر اور فوٹو گرافر آئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ ایسی طالبات اور طلباء بھی تھے جو تعلیم مکمل کر کے یا مختلف شعبوں سے ٹریننگ حاصل کر کے مختلف ممالک سے آئے تھے۔

رن وے کے قریب ہی بہت سی بند گاڑیاں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان میں طالبات کو بیٹھنے کا حکم دیا گیا تا کہ انہیں زنانہ شہر میں پہنچایا جا سکے۔ ایک غیر ملکی خاتون نے کہا۔ ''لیکن میں تو اپنے اخبار کی رپورٹر ہوں، یہاں کی انقلابی تبدیلی پر فیچر لکھنے آئی ہوں۔''

جواب ملا۔ ''تم غیر ملکی ہو، اخباری رپورٹر ہو مگر عورت ہو، اس لئے عورتوں میں جا کر فیچر لکھو، اس شہر میں بیٹھ کر بھی تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔''

دوسری غیر ملکی دوشیزہ نے کہا۔ ''لیکن اس بند گاڑی میں تو ہمارا دم گھٹنے لگے گا۔''

جواب ملا۔ ''جب یہ گاڑی، مردانہ شہری حدود سے باہر نکل جائے گی تو اس کی کھڑکیاں کھول دی جائیں گی پردے سرکا دیئے جائیں گے۔''

طالبات اور دیگر خواتین کے سامان کی چیکنگ ہو رہی تھی، انہیں کسی بھی مرد کی تصویر لے جانے کی اجازت نہیں تھی خواہ وہ باپ، بیٹا یا بھائی ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ زنانہ شہر میں دوسری عورتوں کی نظریں ان تصویروں پر پڑ سکتی تھیں، وہ دوسری عورتوں کے لئے تو باپ اور بھائی نہیں تھے۔ مردوں کیلئے بھی یہی پابندیاں تھیں، وہ اپنے شہر میں کسی بھی عورت کی تصویر نہیں لے جا سکتے تھے۔ اپنی ماں اور بہن کی تصویر اپنے کمرے میں نہیں لگا سکتے تھے۔ کوئی بھی نامحرم آ کر انہیں دیکھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کوئی ایسا کیسٹ بھی اپنے شہر میں نہیں لے جا سکتے تھے جس میں کسی گلوکارہ کی آواز ہو۔ آواز کا پردہ بھی لازمی قرار دیا گیا تھا۔

چیکنگ کے لئے عورتوں اور مردوں کو الگ الگ ہال میں لے جایا گیا تھا۔ ایک غیر ملکی خاتون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر محرم اور نامحرم کی بات ہے تو ہمارے پاس چیکنگ کے لئے عورتوں کو آنا چاہئے۔ تم کیوں آئے ہو۔''

چیکنگ آفیسر نے تالی پیٹ کر کہا۔ ''اے بہنا، ہم تو بیچ والیاں ہیں۔''

اخباری رپورٹروں اور فوٹو گرافروں نے مختلف گاڑیوں میں بیٹھ کر مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے دیکھا، شہر بہت ہی خوبصورت تھا۔ اچھی خوب صورت عمارتیں تھیں۔ خوش لباس لوگ نظر آ رہے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے کوئی کمی رہ گئی ہو، کسی مصور نے بہت ہی خوب صورت خاکہ تیار کیا ہو اور رنگ بھرنا بھول گیا ہو۔

بازاروں میں برائے نام چہل پہل تھی۔ دکانوں میں ریشمی ملبوسات نہیں تھے۔ میک اپ کا سامان نظر نہیں آتا تھا۔ صرف شیونگ کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ وہاں مردانہ کپڑے تھے اور مردانہ جوتے نظر آتے تھے۔ ایک رپورٹر نے دکان دار سے پوچھا۔ ''کیا یہاں ایک عورت کی خاطر آپس میں جوتے چلتے ہیں؟''

دکان دار نے فخر سے کہا۔ ''نہیں، اب ہمارے یہاں امن و امان ہے۔ عورتوں کی وجہ سے کوئی بدمعاشی غنڈہ گردی نہیں ہوتی۔ رقابت تو بالکل ہی ختم ہو گئی ہے۔ کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا۔''

رپورٹر نے پوچھا۔ ''کیا ایسا ہوا ہے کہ ایک مرد کے لئے دو چار عورتوں نے آپس میں غنڈہ گردی کی ہو یا بیچ بازار میں ایک عورت نے دوسری عورت کو قتل کیا ہو؟''

دکان دار نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا تو مرد ہی

کرتے ہیں مگر اب ایسا نہیں کرتے۔ ہمارے معاشرے کی اصلاح ہو چکی ہے۔''

''یعنی مرد معاشرے کی اصلاح ہو چکی ہے؟''

''جی ہاں، معاشرہ تو مرد ہی کا ہوتا ہے۔ عورتیں تو پہلے بھی گھروں میں بند رہتی تھیں، باغی قسم کی عورتیں گھروں سے نکلتی تھیں۔ اب نہ گھر والیاں رہیں، نہ باہر والیاں۔ اب ہم سب کی نیت بالکل پاک صاف رہتی ہے۔''

ایک رپورٹر نے ایک صنعت کار سے سوال کیا۔ ''کیا ایسے انقلابی اقدامات کے بعد صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے؟''

''جی ہاں، اب ہماری توجہ صرف محنت اور قومی ترقی کے لئے وقف ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے بچت بھی سیکھ لی ہے۔ پہلے ہم ہر سال، نئے ماڈل کی کار خریدتے تھے۔ بیوی کو خوش کرتے تھے۔ اب بیوی سے ہفتے میں ایک بار سرحدی بستی میں ملنے جاتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی بھی سستی سی گاڑی کام آسکتی ہے۔ جھوٹی شان و شوکت اور نمائش کی عادت، عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ دوسری عورتوں کے مقابلے میں خود کو برتر ثابت کرنے کے لئے اپنے گھر میں رنگین ٹی وی ایئر کنڈیشنڈ کار، قیمتی زیورات اور ملبوسات کے تقاضے کرتی رہتی ہیں، ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہم انکم ٹیکس کی چوری کرتے تھے۔ کالی دولت اپنی بیویوں اور محبوباؤں کے لئے چھپا کر رکھتے تھے۔ اب یہ ساری دولت حکومت کے خزانے میں ہم راضی خوشی دے رہے ہیں۔''

''ایک سوال اور ہے، وہ یہ کہ جب دولت مند خواتین سرحدی بستی میں اپنے شوہروں سے ملنے آتی ہوں گی تو خوب بن سنور کر اور قیمتی زیورات پہن کر آتی ہوں گی؟''

''ہاں، ابتدا میں ایسا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے بننا سنورنا اور زیورات پہننا چھوڑ دیا۔ اب بڑی سادگی سے ملنے آتی ہیں۔''

''بھلا وہ کیوں؟''

''اس لئے کہ زیورات اور سولہ سنگھار دکھانے کے لئے ہوتا ہے، اب وہ کسے دکھائیں گی۔ جب زنانہ شہر سے وہ سرحدی بستی میں آتی ہیں تو سر سے پاؤں تک برقعے میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں ہماری ملاقات کیلئے چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے ہیں۔ ان کوارٹروں میں سے کوئی عورت باہر نہیں نکلتی۔ صرف اپنے شوہر کے ساتھ یا اپنے بچوں کے

ساتھ وہاں ایک دن گزارتی ہیں، کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا ان کی تعریف کرنے والا نہیں ہوتا۔ کسی کی خاموش نگاہیں بھی ان کے حسن پر شاعری نہیں کرتیں۔ صرف شوہر یا بچے انہیں دیکھتے ہیں اور یہ تو برسوں سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ انہیں اور کیا دکھائیں گی۔''

''کیا زنانہ شہر میں پردے کا رواج ہے؟''

''جی نہیں، بھلا وہاں کس سے پردہ؟ وہاں تو سبھی عورتیں اور لڑکیاں ہیں۔ وہاں وہ آزادی سے کھلے آسمان کے نیچے گھومتی ہیں، مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتی ہیں، تازہ ہوا کھاتی ہیں اور اپنی جان بناتی ہیں۔ میری بیوی پہلے سے زیادہ صحت مند اور جوان نظر آنے لگی ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ آپ کی شریک حیات پہلے سے زیادہ صحت مند اور جوان نہ ہوں۔ آپ چھ دن کے انتظار کے بعد ساتویں دن ملنے جاتے ہیں تو کیا یہ نفسیاتی حقیقت نہیں ہے کہ شدتِ طلب میں عورت اپنی عمر سے زیادہ جوان اور اپنے حسن سے زیادہ حسین نظر آتی ہے؟''

''میں صنعت کار ہوں، نفسیاتی باتیں نہیں سمجھتا۔''

ایک اور رپورٹر نے ایک عالم دین سے سوال کیا۔ ''کیا یہ پردے کی انتہا نہیں ہے کہ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ شہر بسائے گئے ہیں؟''

عالم دین نے جواب دیا۔ ''اسلام میں ایسے پردے کی اجازت نہیں ہے۔ عورت انسانی معاشرے کا ایک اہم حصہ ہے، اس کے لئے صرف پردے کی شرط ہے۔ یہ شرط بھی اتنی سی ہے کہ آنکھ کا پردہ ہو، مرد کی آنکھ اسے دیکھ نہ سکے۔ آواز کا پردہ ہو، وہ اتنی دھیمی آواز میں بولے کہ وہ آواز کسی مرد کے کانوں تک نہ پہنچے۔ عورتوں نے اس پر طرح طرح سے اعتراضات کئے۔ آخر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ عورتیں کھلی فضا میں رہنا چاہتی ہیں، گھر کی چار دیواری میں قید نہیں رہنا چاہتیں۔ لہٰذا ان کے لئے ایک الگ شہر بسایا جائے وہاں وہ دوسری عورتوں سے آزادی کے ساتھ مل سکیں اور آزادی سے گھوم پھر سکیں۔ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا اور کوئی انہیں بری نظروں سے دیکھنے والا نہ ہو۔''

''انہیں الگ رکھنے کا اور کوئی مقصد بھی ہے؟''

''ہاں، عورتوں کی طرف سے یہ چیلنج بھی ہے کہ مرد، اُن کے بغیر نہیں رہ سکتے اور مردوں کا دعویٰ ہے کہ جتنے جنسی جرائم ہوتے ہیں، وہ محض عورتوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ان کی شہہ پر، ان کی نمائش پر بے حیائی عام ہوتی ہے، لہٰذا یہ جو زنانہ اور مردانہ شہر بسائے گئے ہیں تو یہ کوئی اسلامی طریقۂ کار نہیں ہے۔ یہ محض ایک تجربہ ہے، ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کے دور ہو جانے سے مرد پارسا اور پاکیزہ زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سے تجربات ہیں۔ مثلاً مردوں کی محنت یا کام کی لگن میں اضافہ ہوتا ہے یا نہیں، اور ہمیں فخر ہے کہ زرعی پیداوار اور صنعتی ترقی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ باہر سے آنے والے آرائشی اور نمائشی سامان اور دیگر سامان تعیش میں تقریباً ستر فیصد کمی ہو گئی ہے۔ ایک آدھ سال میں یہ تمام عیش و عشرت کے تقاضے ختم ہو جائیں گے۔ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سادگی، پاکیزگی اور پارسائی ہوگی۔''

''آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگر آپ مکمل کامیابی حاصل کر لیں گے تو ہم بھی اپنے ملکوں میں عورت کش ڈی، ڈی، ٹی چھڑک کر مردانہ معاشرے کو پاک صاف اور پارسا بنا لیں گے۔''

☆======☆======☆

دور سے آتش فشاں خاموش دکھائی دیتا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے اندر لاوا پکتا رہتا ہے۔ سمندر کی لہریں خاموش اور پُرسکون رہیں تو ان کی تہہ میں طوفان انگڑائیاں لیتے رہتے ہیں، کتنے جوانوں کو انگڑائیاں آتی ہیں۔ اس کا حساب کوئی نہیں کرتا۔ انگڑائیاں لینے والے خود اپنا حساب کرتے ہیں۔

انہوں نے پانچ برس سے اپنے شہر میں ایک بھی حسین تصویر نہیں دیکھی تھی، کوئی مترنم آواز نہیں سنی تھی۔ کسی کے رعنائی ہاتھوں کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھایا تھا۔ خود پکاتے تھے یا ہوٹلوں میں کھاتے تھے۔ جب وہ دن بھر کے تھکے ماندے گھر واپس آتے تو کوئی آنکھ ان کا انتظار نہیں کر رہی ہوتی تھی۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے معلوماتی پروگرام نشر کئے جاتے تھے۔ قوالیاں پیش کی جاتی تھیں، یا پھر ایسے ڈرامے نشر کئے جاتے تھے جن میں صرف مردوں کے کردار ہوتے تھے۔ ان ڈراموں میں نہ تو عورتوں کی آواز سنائی دیتی تھی اور نہ ہی عورتوں کا کوئی ذکر آتا تھا۔

دوسری طرف زنانہ شہر میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پابندی تھی۔ وہاں کسی بھی زنانہ گھر میں ریڈیو، ٹیلی ویژن یا کیسٹ ریکارڈ وغیرہ نہیں تھے۔ وہ کسی بھی ذریعے سے نہ تو مرد کی صورت دیکھ سکتی تھیں اور نہ ہی آواز سن سکتی تھیں۔ ہر چھ دن کے بعد اپنے شوہر، اپنے بیٹے، اپنے بھائی اور اپنے باپ کی صورتیں دیکھ سکتی تھیں اور ان کی ہی آوازیں سن سکتی تھیں لیکن عورت ہو یا مرد وہ کب تک ایک ہی ریکارڈ سن سکتے ہیں۔

ایسے ہزاروں لوگ تھے جن کے والدین مر چکے تھے۔ ان کا نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن تھی، نہ رشتے کی کوئی خالہ تھی، نہ پھوپھی تھی۔ ہر ملک، ہر شہر میں ایسے بے شمار لوگ تنہا زندگی گزارتے ہیں یا پھر کسی کو منہ بولی بہن، ماں، خالہ یا پھوپھی بنا لیتے ہیں اور دل کے ان رشتوں سے بہل جاتے ہیں۔ اپنی محرومیاں بھول جاتے ہیں۔

ایسے بدنصیب لوگوں کا سرحدی بستی میں داخلہ ممنوع تھا۔ وہ کسی بھی منہ بولے رشتے دار سے ملنے کے لئے وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ جواز یہ تھا کہ اگر ایک کو اجازت دی جائے گی تو پھر فراڈ شروع ہوگا۔ لوگ یونہی منہ بولا رشتہ قائم کریں گے اور اس رشتے کے ذریعے وہاں جا کر گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

بابر نے رابطہ کمیٹی کے آفیسر سے کہا۔ ''آپ اتنے بڑے دفتر کے انچارج ہیں۔ زنانہ شہر کی عورتوں کو ان کے شوہروں سے ملاتے ہیں۔ مردانہ شہر کے بیٹوں کو ان کی ماؤں سے اور بھائیوں کو ان کی بہنوں سے ملنے کا موقع دیتے ہیں، کیا آپ مجھے یہ موقع نہیں دے سکتے؟''

رابطہ کمیٹی کے انچارج آفیسر نے کہا۔ ''میں مجبور ہوں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ زبان سے کوئی رشتہ قائم کرو گے تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔''

''جناب، یہ تو سوچئے کہ اکثر خون کے رشتے پانی ہو جاتے ہیں مگر دل کی گہرائیوں میں جو رشتہ قائم کیا جاتا ہے وہ پائیدار ثابت ہوتا ہے۔''

انچارج نے کہا۔ ''تو پھر دل کی گہرائیوں سے کسی کو دل میں جگہ دو۔ کسی سے شادی کرو۔ جب تمہاری کوئی شریکِ حیات ہوگی تو اس کی بہن کو اپنی بہن بنا لینا، اس کی ماں کو اپنی ماں بنا لینا، تمہاری حسرتیں پوری ہو جائیں گی۔''

بابر نے کہا۔ ''ہم نے خدا کو نہیں دیکھا۔ ہم نے اس کی آواز نہیں سنی لیکن دل کی

گہرائیوں سے اسے مانتے ہیں، اس کی عبادت کرتے ہیں، اس سے ڈرتے ہیں، اسے اپنا سمجھ کر کچھ مانگتے ہیں، صرف خدا کی ذات ایسی ہے جسے، دیکھے بغیر، جسے سنے بغیر، ہم دل سے چاہتے ہیں، لیکن کسی لڑکی کو دیکھے بغیر، اس کے متعلق سنے اور سمجھے بغیر شریکِ حیات نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ یہ زندگی بھر کا سودا ہوتا ہے اور ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ ہم نے پانچ برس سے کسی لڑکی کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ ہم بھولتے جارہے ہیں کہ لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔''

''بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے آخر اندھے کسی کو دیکھے بغیر اور بہرے کسی کو سنے بغیر زندہ رہتے ہی ہیں۔''

بابر جھنجلا کر دفتر سے باہر آ گیا۔ عمارت کے باہر ایک بوڑھے سے سامنا ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ''بابا، آپ نے ایک دنیا دیکھی ہے، آپ بتائیں، عورت کیسی ہوتی ہے؟''

بوڑھے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر کہا۔

''انسان ہوتی ہے، تمہارے جیسی ہوتی ہے، میرے جیسی ہوتی ہے۔''

بابر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ جیسی ہو تو پھر میں کبھی شادی نہ کروں۔''

وہ تیزی سے چلتا ہوا سڑک کے کنارے آیا۔ اسی وقت ایک کار اس کے قریب آ کر رک گئی۔ کار کی پچھلی سیٹ پر اسے راحت بیگ نظر آیا۔ راحت بیگ اس کا کلاس فیلو تھا بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ بچپن ہی سے بہت خوبصورت اور دبلا پتلا سا تھا، اب بھی اس کی جسامت ویسی ہی تھی، چہرے پر بھی بڑا نکھار تھا لیکن اب وہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال، کانوں سے نیچے اور شانوں سے اوپر تک لانبے اور ریشم کی طرح ملائم نظر آ رہے تھے، آنکھوں میں کاجل یا سرمہ لگا ہوا تھا، چہرے پر کریم اور پوڈر کی تہیں جمی ہوئی تھیں جو اس نے لگا رکھی تھیں۔

کار کے ڈرائیور نے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ راحت بیگ ایک ادائے ناز سے، ذرا لچکتے ہوئے، ذرا بل کھاتے ہوئے کار سے باہر آیا۔ باہر آتے ہی اس کی نظر بابر پر پڑی۔ اس نے دونوں بازو پھیلا کر 'ہائے' کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہائے میں مرگئی۔ میری جان بابر! یہ تُو ہے۔''

یہ کہتے ہی اس نے آگے بڑھ کر بابر کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ بابر نے بوکھلا کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ راحت بیگ، یہ تم ہو؟''

''اے چھوڑ بھی، میں راحت بیگ نہیں رہی۔ اب راحت جان بن گئی ہوں۔''

بابر نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ راحت جان پتلون اور بشرٹ پہنے ہوئے تھی (تھا) اس نے کہا۔ ''آہ، میرے لباس کو نہ دیکھو۔ اس شہر میں زنانہ لباس پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر اجازت ہوتی تو تم میری بہار دیکھتے۔''

اتنی دیر میں ان کے آس پاس لوگوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ بابر نے سمجھا کہ اب راحت جان کا مذاق اڑایا جائے گا۔ لوگ اسے چھیڑیں گے لیکن خلافِ توقع سب کے سب راحت جان کو بڑے شوق سے اور بڑی چاہت سے دیکھ رہے تھے کیونکہ دیکھنے کے لئے اب راحت جانیں ہی رہ گئی تھیں یا رہ گئے تھے۔ پھر بابر نے مزید حیرانی سے دیکھا۔ کچھ لوگ اپنے آٹوگراف بک لئے راحت جان کی طرف بڑھ رہے تھے اور آٹوگراف کی فرمائش کر رہے تھے۔ راحت جان، بابر کے بازو کو تھام کر ان سے کترا کر نکلنا چاہتی تھی یا چاہتا تھا لیکن لوگ خوشامدیں کرتے ساتھ چل رہے تھے۔ راحت جان نے بڑی بے نیازی سے دو چار آٹوگراف بکس میں کچھ لکھا۔ پھر رابطہ کمیٹی کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ بابر اس کے ساتھ تھا بلکہ راحت جان نے خود اسے ساتھ رکھا تھا۔

رابطہ کمیٹی کے انچارج آفیسر نے راحت جان کو دیکھتے ہی اٹھ کر مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ ''آؤ، راحت بڑے موقع سے آئے ہو، تمہارے لئے ایک بہت شان دار پروگرام ہے۔''

راحت جان نے بیٹھتے ہوئے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ''میں ادھر سے گزر رہی تھی تو سوچا تم سے ملاقات کرتی چلوں، ورنہ مجھے تو پرائیویٹ محفلوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔''

انچارج نے کہا۔ ''راحت جان، یہ سچ مچ بہت بڑا پروگرام ہے، تمہاری اور زیادہ شہرت ہوگی، اور منہ مانگی رقم ملے گی۔ ایک بہت بڑے عہدہ دار کی بیٹی کی شادی ہے۔ تمہارے لئے سرحدی بستی میں جانے کا اجازت نامہ ابھی تیار ہو جائے گا، بس تم ہاں کر دو۔''

شادیاں سرحدی بستی میں ہوا کرتی تھیں اور نہایت سادگی سے ہوا کرتی تھیں، چند

باراتیوں کو خصوصی اجازت نامے حاصل ہوتے تھے اور نکاح پڑھانے کے دوران بھی پردے کی سخت پابندی ہوتی تھی۔ زنان خانہ الگ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود شادی کی خوشیوں میں عورتوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں دور تک سنائی دیتی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے کبھی کبھی ان کی جھلک نظر آجاتی تھی اور یہ چٹکی بھر نظارہ ایسا ہوتا تھا کہ بعد میں باراتیوں کی نیندیں کئی کئی راتوں تک اڑ جاتی تھیں۔

اگرچہ شادی بیاہ میں نمائش اور دھوم دھام کی اجازت نہیں تھی لیکن ہر زمانے کے دستور کے مطابق دولت مند اور اونچی حیثیت کے لوگ دھوم دھام اور نمائش کے لئے خصوصی اجازت نامہ حاصل کر لیتے تھے۔ پھر جیسا کہ تلوار چلانے والے سپاہی کا ہاتھ کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اسی طرح خسروں کو ناچنے گانے سے کوئی نہیں روک سکتا، وہ شادی بیاہ اور بچے کی پیدائش کے موقع پر سینہ پیٹ پیٹ کر اپنا حق منوا لیتے ہیں، ڈرتے نہیں۔

بابر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”راحت، کیا تم لوگوں کو اتنی آسانی سے سرحدی بستی میں جانے کا موقع مل جاتا ہے؟“

راحت نے کہا۔ ”کیوں نہیں ملے گا یہ تو ہمارا حق ہے۔ ہماری کتنی ہی بہنیں وہاں ناچنے گانے جاتی ہیں۔ مجھے تو فرصت نہیں ملتی۔“

بابر نے پوچھا۔ ”اگر تم وہاں جاؤ تو کیا میں تمہارے ساتھ جا سکتا ہوں؟“

راحت نے پوچھا۔ ”کیا تم سرحدی بستی میں جانا چاہتے ہو؟“

”اگر تم مجھے لے چلو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں پانچ برس ہو گئے۔ میں نے کسی لڑکی، کسی عورت کی صورت نہیں دیکھی ہے۔“

”اے جانِ راحت جان، نہیں دیکھی ہے تو مجھے دیکھ لو۔“

”اگر لڑکیاں ایسی ہوں گی تو پھر میں کبھی دیکھنے کی تمنا نہیں کروں گا۔ مجھے لے چلو۔“

انچارج نے بابر سے کہا۔ ”اے مسٹر، تم ابھی تھوڑی دیر پہلے آکر مجھے پریشان کر رہے تھے اور وہاں جا کر کسی کو بہن بنانا چاہتے تھے۔ اب کسی لڑکی کی صورت دیکھنے کی تمنا کر رہے ہو؟“

بابر نے جواب دیا۔ ”آخر بہن بھی تو لڑکی ہوتی ہے اور بہن کی صورت دیکھنا کوئی

گناہ تو نہیں ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ میں کسی سے شادی کروں تو اس کا فیصلہ میرا دل خود بخود کرے گا۔ میں نہیں کروں گا۔ ہاں بہن اور ماں تو کسی کو بھی بنایا جا سکتا ہے۔“

انچارج نے پوچھا۔ ”مگر تم، راحت جان کے ساتھ، وہاں کس حیثیت سے جاؤ گے؟“

راحت جان نے کہا۔ ”میں یہ پروگرام لینا نہیں چاہتی تھی لیکن اپنے جانی دوست کے لئے منظور کر لیتی ہوں۔ بابر کو ایک باراتی کی حیثیت سے اجازت نامہ دے کر میرا پرسنل سیکرٹری بنا دو۔“

پھر وہ اٹھتے ہوئے بابر سے بولی یا بولا۔ ”کم آن سیکرٹری، کل صبح، یہاں آکر ہمارا اجازت نامہ حاصل کر لینا اور اب تم میرے ساتھ رہو گے، چلے آؤ۔“

وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا عمارت سے باہر آیا۔ پھر اس کی قیمتی ایئر کنڈیشنڈ کار کی پچھلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ تب اس نے پوچھا۔ ”راحت، یہ سب کیا ہے۔ تم تو بہت اچھے طالب علم تھے۔ بہت ذہین تھے، تم نے یہ کیا روپ بدلا ہے؟“

اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”میری بات پوچھو گے تو پھر ہزاروں، لاکھوں بیروزگار نوجوانوں کی باتیں بھی پوچھنا چاہئے، بیروزگاری، انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے، زنانہ شہر میں میری ایک بوڑھی ماں ہے جو محنت نہیں کر سکتی۔ میری ایک پندرہ سال کی بہن تھی جو تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اب تعلیم سے فارغ ہونے والی ہے۔ ان کے اخراجات میں کہاں سے پورے کرتا۔ شہر تو دو حصوں میں بٹ گئے۔ مرد اور عورت تقسیم ہو گئے اس کے ساتھ دو چولہے ہو گئے۔ ایک چولہا مجھے اپنے لئے ادھر جلانا ہوتا ہے۔ ایک چولہا انہیں اپنے لئے اُدھر جلانا ہوتا ہے۔ دو طرفہ اخراجات بڑھ گئے۔ جب کہ غریب آدمی ایک ہی گھر اور ایک ہی چولہے کو نہیں سنبھال سکتا۔“ راحت جان کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور اداسی چھا گئی تھی اس نے کہا۔ ”اس تقسیم کو پانچ برس گزر چکے ہیں، پہلے سال، میں نوکری کے لئے دھکے کھاتا رہا، فاقے کرتا رہا۔ جب کچھ حاصل نہ ہوا اور اُدھر سے بھی یہ اطلاع ملنے لگی کہ میری بوڑھی ماں، فاقے کرتی ہے۔ میری بہن کے سکول کی فیس نہیں دے سکتی۔ تب میں تڑپ گیا۔ میں نے سوچا، کوئی الٹا سیدھا دھندا کرنا چاہئے۔ جا...

ناجائز کی تمیز کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے۔''

''اوراسی لئے تم نے اپنی یہ زندگی حرام کرلی ہے؟''

اس نے پھر ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔''ہاں، میں نے دیکھا کہ جیسے جیسے لوگوں کی محرومیاں بڑھتی جارہی ہیں ویسے ویسے خسروں کا کاروبار چمکتا جارہا ہے۔ان کی عزت ہو رہی ہے۔ ان کی قدر بڑھ رہی ہے۔ کتنے ہی خسروں نے اپنے چھوٹے بڑے ذاتی مکانات بنوالئے، کچھ نے اتنی دولت کمائی کہ اپنے لئے شان دار کوٹھیاں بنوالیں، بینک بیلنس بڑھالئے، تب میں نے بھی یہ راہ اختیار کرلی۔''

''یہ ایئر کنڈیشنڈ کار کس کی ہے؟''

وہ فخر سے بولی یا بولا۔''میری ہے۔ میری ذاتی ہے میری ایک ذاتی کوٹھی بھی ہے۔''

بابر نے حیرانی سے پوچھا۔''تم نے پانچ برس میں اتنا کچھ حاصل کرلیا؟''

''پانچ برس نہیں، تین برس میں۔ ایک برس تو میں نے ٹھوکریں کھائیں، دوسرے برس ناچنے گانے اور ناز وانداز دکھانے کا فن سیکھا۔ کوئی خسرا یا خسری میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک دولت مند مجھ پر مہربان ہوگیا۔ مجھ سے دوستی کرلی ہے۔ اس نے میرے نام ایک کوٹھی لکھ دی ہے۔ یہ کار خرید کردی اور ہر ماہ مجھے دس ہزار روپے دیتا ہے۔''

''کمال ہے، ایسے مہربان دوست کم ملتے ہیں۔''

''اب زیادہ ملتے ہیں۔ کیونکہ اب محرومیاں بڑھ گئی ہیں۔''

''کیا تم خوش ہو؟''

راحت جان نے کھڑکی کی طرف منہ پھیرلیا جیسے منہ چھپارہی ہو یا چھپارہا ہو پھر اس نے کہا۔''میری ماں اب صحت مند ہے، میری بہن اعلیٰ تعلیم حاصل کررہی ہے۔ وہ خوش ہیں۔''

''کیا وہ تمہارے اس روپ سے واقف ہیں۔''

''نہیں، میں ان کے لئے امریکہ میں رہتی ہوں یعنی ان کے لئے رہتا ہوں۔ ان کیلئے وہاں محنت کرتا ہوں، کماتا ہوں اور وہاں سے بھاری رقمیں بھیجتا ہوں۔ دراصل یہ رقمیں میرا سرمایہ دار دوست، امریکہ سے ارسال کرتا ہے میں کبھی سرحدی بستی میں نہیں جاتی

باہر نکلنا چاہتا تھا اور امی کے سینے سے لگنا چاہتا تھا۔ ان کے آنسو مجھ سے دیکھے نہیں جارہے تھے۔ بہن کے آنسو پونچھنے کے لئے میرے ہاتھ مچل رہے تھے مگر میں یہ سب کچھ کس رشتے سے کرسکتا تھا؟''

بابر نے کہا۔''اس بار تم نے خود مرد کی حیثیت سے کہا ہے کہ میں کس رشتے سے ایسا کرسکتا تھا۔ تم نے یہ نہیں کہا ایسا کرسکتی تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر اس موجودہ بہروپ پر ایک بھائی کی شخصیت حاوی ہورہی ہے، تم بنیادی طور پر مرد ہو اور یہ مرد اپنی کسی بیوی کے لئے، کسی محبوبہ کے لئے بیدار ہو یا نہ ہو لیکن اپنی ماں اور بہن کے لئے قدرتی طور پر تڑپتا ہے۔''

اس نے کہا۔''میں امی اور درخشاں سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب تک ان سے دور رہا، انہیں میں نے نہیں دیکھا۔ اس وقت تک خود کو سنگ دل بناتا رہا مگر اب اگر میں نے ان سے بیٹے اور بھائی کی حیثیت سے ملاقات نہیں کی تو مرجاؤں گا۔''

بابر نے بڑے پیار سے سوچا۔''اچھا تو اس مہ لقا کا نام درخشاں ہے جو نام بھاری بھر کم ہوتے ہیں مجھے اچھے نہیں لگتے مگر محبت میں یہ نام بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ اگر اس کا نام جنوری بیگم یا فروری بیگم ہوتا تب بھی اچھا لگتا۔ نام خواہ کیسا ہی معمولی یا مضحکہ خیز ہو، اگر وہ محبت سے گلے لگ جائے تو گلے کے ہار سے زیادہ خوشبو لٹاتا ہے۔ درخشاں میرے دل ودماغ میں خوشبو لٹارہی ہے۔'

راحت نے پوچھا۔''کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ خیالات سے چونک گیا۔ اس نے بات بنائی۔

''میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا ہوں، یوں بھی مردانہ لباس پہنتے ہو۔ اگر اپنے یہ بال اتنے لانبے نہ رکھو، انہیں تراش کر چھوٹے کرالو، عورتوں کی طرح میک اپ نہ کرو اور دوروز صبر کرلو تو تمہاری مونچھیں نکل آئیں گی۔ پھر تم بیٹا اور بھائی بن کر ان سے مل سکو گے۔''

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے لیکن کچھ مشکلات پیش آئیں گی۔''

''کیسی مشکلات؟''

''میں تقریباً چار برس سے راحت جان کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہوں۔

میرے پاس جو شناختی کارڈ اور دوسرے کاغذات ہیں وہ مجھے راحت جان ظاہر کرتے ہیں۔ جب تک راحت بیگ کی حیثیت سے میرے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوگا اور سرحدی بستی میں جانے کے لئے، اپنی ماں، بہن سے ملاقات کرنے کے لئے ضروری کاغذات نہیں ہوں گے اس وقت تک میں ان سے مل نہیں سکوں گا۔''

''تمہارے وہ راحت بیگ کی حیثیت والے شناختی کارڈ اور کاغذات کیا ہوئے؟''

''میرے وہ تمام کاغذات ٹرانسفر ایجنسی میں ہیں۔''

''یہ ٹرانسفر ایجنسی کیا چیز ہے؟''

''ایک ادارہ ہے۔ اس ادارے کے مالک کا نام بہروز ہے۔ وہ بہت ہی چالاک اور موقع شناس ہے۔ اس نے یہ ایجنسی کھول رکھی ہے۔ اس ایجنسی کا کام یہ ہے کہ یہ لوگ راحت بیگ کو راحت جان اور نسیم احمد کو نسیم بیگم میں ٹرانسفر کر دیتے ہیں اور اس طرح دولت مند شہریوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔'' اس نے کتے کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کاروبار کا پرانا دستور ہے کہ بازار میں اگر کسی ایک مال کی کمی کر دی جائے تو اس مال کی قیمت بڑھ جاتی ہے یا اگر اس مال کا متبادل پیش کر دیا جائے تو لوگ اسے بھی مجبوراً قبول کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہی ہو رہا ہے۔ اب ہمارے شہر میں عورتیں نہیں رہیں۔ ان کی جگہ کون لے گا۔ کون کھانا پکائے گا۔ کون گھر کی صفائی کرے گا۔ کون ہمارے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرے گا؟''

بابر نے کہا۔ ''ایسا مرد ملازم رکھ سکتے ہیں۔''

راحت جان نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، مرد ملازم، عورتوں کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ ہم ہو سکتے ہیں اور ہم ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ بہروز کاروباری ذہنیت کا آدمی ہے۔ جب مردانہ اور زنانہ شہر قائم ہو رہے تھے۔ تب ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا کاروبار کیسے چمک سکتا ہے۔ جو بیروزگار ہوتے ہیں یا اور کسی نہ کسی طرح ضرورت مند ہوتے ہیں وہ بہروز کے پاس پہنچ جاتے ہیں یا بہروز کے ایجنٹ انہیں گھیر کر اپنے ادارے میں لے آتے ہیں اور انہیں ٹرانسفر کر دیتے ہیں۔ پہلے لوگ دوبئی جا کر ہزاروں روپے کماتے تھے مگر اب یہاں ٹرانسفر ہو کر ہزاروں کما لیتے ہیں۔ کسی گھر میں باورچی بن کر رہنے یا اوپری کام کرنے کے سلسلے میں انہیں ماہانہ تین چار ہزار مل جاتے

ہیں۔ جو میری طرح خوب صورت اور نازک اندام ہوتے ہیں انہیں میری طرح آمدنی ہوتی ہے۔ ماہانہ دس ہزار، پندرہ ہزار، پھر کوٹھی، کار اور بینک بیلنس الگ ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ شاہوں کے تاج اور تخت حسین عورتوں کی ٹھوکروں میں ہوا کرتے تھے۔ ہماری ٹھوکروں میں بھی ہوتے ہیں۔''

بابر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''یہ نہایت ہی غور کرنے کا مقام ہے۔ بہر حال تم بہروز سے اپنے کاغذات لے سکتے ہو۔''

''نہیں لے سکتا۔ وہ بہت ہی مکار اور کاروباری ذہنیت رکھنے والا آدمی ہے جب وہ ٹرانسفر کرتا ہے تو ہمارے پچھلے کاغذات اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ اس کے ذریعے بلیک میل کرتا ہے۔ ہماری ماہانہ آمدنی کا پانچ فیصد طلب کرتا ہے۔ جس کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے، اس سے زیادہ مانگتا ہے۔ مثلاً مجھ سے بیس فیصد حاصل کرتا ہے یعنی دس ہزار کی آمدنی میں دو ہزار روپے وصول کرتا ہے۔ یہ رقم میری طرف سے خان دلاور خان اسے ادا کرتا ہے۔ اگر یہ رقم ادا نہ کی جائے تو پھر وہ دھمکی دیتا ہے کہ ہمارے رشتے داروں کو ہماری اصلیت بتا دی جائے گی۔ مجھ جیسے لوگ اس سے ڈرتے ہیں، میں خود ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ میری امی اور بہن کو میری موجودہ حیثیت کی خبر نہ پہنچا دے۔ جو لوگ ان باتوں سے نہیں ڈرتے ان کے ساتھ وہ دوسرا سلوک کرتا ہے۔ اس کے پاس چھٹے ہوئے بدمعاش، غنڈے اور قاتل ہیں۔ وہ لوگ ایسے خسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں جو بہروز کا کمیشن ادا نہیں کرتا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ بہروز تمہارے وہ راحت بیگ والے کاغذات واپس نہیں کرے گا۔''

''کبھی نہیں کرے گا۔ جس کے ذریعے اسے ماہانہ دو ہزار روپے کی آمدنی ہے اسے وہ ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ کار تیزی سے دوڑتی جا رہی تھی۔ اب وہ مردانہ شہر میں داخل ہو گئے تھے۔ راحت جان نے کہا۔ ''میری بہن درخشاں کو تمہارے جیسا جیون ساتھی ملے تو اس سے بڑھ کر میرے لئے خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوگی۔ میں دل و جان سے تم دونوں کو ازدواجی رشتے میں منسلک ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے

کہ میں بھائی بن کر اور اپنی ماں کا بیٹا بن کر ان سے ملاقات کروں اور پھر تمہارے رشتے کی بات آگے بڑھاؤں۔"

بابر نے ایک دم سے تڑپ کر کہا۔"تم ضرور بیٹے اور بھائی بن کر ان سے ملو گے۔ میں بہروز سے وہ کاغذات چھین کر لاؤں گا۔ چھین نہ سکا تو چوری کروں گا۔ کسی نہ کسی طرح تمہاری پہلے والی حیثیت تمہیں واپس دلاؤں گا۔"

راحت نے تھوڑی دیر بعد ڈرائیور کو ایک جگہ گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ پھر ایک بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"وہ دیکھو، وہاں ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا ہے۔"بہروز گڈز سپلائیر۔" یہ بہروز کا دفتر ہے۔ بظاہر وہ خان دلاور خان اور دوسرے بڑے بڑے سرمایہ داروں سے کم حیثیت کے ضرورت مندوں سے رابطہ رکھتا ہے اور کھاتے میں یہ درج کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی گھریلو ضروریات کی چیزیں سپلائی کرتا ہے۔ اس کے پیچھے جو کاروبار ہے وہ تمہیں بتا چکا ہوں۔"

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ بابر نے کہا۔"جب کاروبار سامنے کچھ اور، پیچھے کچھ اور ہے تو یقیناً وہ بلیک میلنگ کے تمام کاغذات کہیں اور چھپا کر رکھتا ہوگا۔ دفتر میں ایسی چیزیں نہیں رکھی جاتیں۔ اس کے گھر کی تلاشی لی جاسکتی ہے یا کسی ذریعے سے معلوم کرنا ہوگا کہ اس کی مصروفیات کیا ہیں وہ کہاں کہاں اُٹھتا بیٹھتا ہے، اس کی رہائش گاہ کے علاوہ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں وہ ایسے راز چھپا کر رکھ سکتا ہے۔"

بابر نے اپنے گیراج کے سامنے گاڑی رکوادی، مین بازار میں اس کا ایک موٹر گیراج تھا۔ اس نے راحت سے بہروز کی کوٹھی کا پتا معلوم کیا۔ پھر وعدہ کیا کہ دوسرے دن صبح تک وہ کاغذ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور راحت کی کوٹھی میں آکر اس سے ملاقات کرے گا۔

راحت جان وہاں سے چلا گیا۔ بابر اپنے گیراج کے دفتری کمرے میں آیا۔ تمام ملازم اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ گاڑیوں کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس نے ایک نوجوان کو بلا کر بہروز کی کوٹھی کا پتا بتاتے ہوئے کہا۔ تمہیں اس کوٹھی میں جانا ہے اور وہاں اس کی کار میں کچھ ایسی خرابی پیدا کرنا ہے کہ اسے ہماری ضرورت پیش آئے۔"

نوجوان کاریگر نے کہا۔"وہ تو میں کروں گا لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ وہ ہم ہی سے

اپنی کار درست کرائے۔ بہروز کی کوٹھی یہاں سے میلوں دور ہے۔"

بابر نے کہا۔"اس کار میں خرابی پیدا کرنے کے بعد وہاں ایک پرچی چھوڑ آنا۔ اس میں لکھنا کہ کار کی مرمت کے لئے بابر موٹر گیراج سے رابطہ قائم کریں۔"

"اس طرح تو ہم گرفت میں آجائیں گے۔"

"تم پرواہ نہ کرو۔ جو کہتا ہوں وہی کرو۔ بہروز کا کوئی آدمی یہاں آئے گا تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

وہ نوجوان کاریگر چلا گیا۔ بابر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے اپنے گیراج کے ایک چھوکرے کو بلایا۔ وہ کوئی تیرہ چودہ برس کا لڑکا تھا۔ اچھا، خوب صورت تھا۔ دبلا پتا سا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ اور منہ پر کالک لگی ہوئی تھی۔ وہ ریپئرنگ کے کام میں مصروف تھا۔ بابر نے کہا۔"شمشاد، میں ابھی کھانے کے بعد سونے جا رہا ہوں۔ تم دوپہر کو اپنا کام بند کردینا۔ نہا دھو کر جو تمہارے پاس بہترین لباس ہے وہ پہن لینا۔ میں کسی وقت بھی ایک کار کی مرمت کے لئے جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔"

شمشاد چلا گیا۔ بابر، گیراج کے پیچھے اپنے ایک پرائیویٹ کمرے میں گیا۔ وہاں ہوٹل سے کھانا منگا کر کھایا۔ پھر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چلی تھی۔ نوجوان کاریگر اسے آوازیں دے کر اُٹھا رہا تھا۔ اس نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔"کیا ہوا؟"

"جو آپ چاہتے تھے وہی ہوا۔ میں نے تو دوپہر کو ہی اس کی کار میں خرابی پیدا کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں مسٹر بہروز خود یہاں آئے ہیں، بہت غصے میں ہیں۔ ہم نے یقین دلایا ہے کہ یہ ہماری شرارت نہیں ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

بابر نے کہا۔"شمشاد سے کہو۔ کوئی ٹھنڈا مشروب لاکر بہروز کو پلائے اور اس سے باتیں کرتا رہے۔ میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر، لباس بدل کر آتا ہوں۔"

نوجوان کاریگر وہاں سے جانے لگا۔ بابر نے پھر اسے مخاطب کیا۔"سنو، اس بات کا خیال رکھنا کہ بہروز کے سامنے صرف شمشاد جائے اور وہی اس کی خاطر مدارت کرے، بس اب جاؤ۔"

وہ چلا گیا، بابر نے نہایت اطمینان سے غسل کیا۔ پھر لباس پہن کر دفتر میں پہنچا تو

وہاں ایک ادھیڑ عمر کا شخص نظر آیا۔ اس کی آنکھوں پر آدھے فریم کی عینک تھی۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ اس کی قریبی نظر کمزور ہے۔ دور کی نظر ٹھیک تھی اس لئے عینک کے اوپری حصوں پر نہ تو شیشے تھے نہ فریم تھا۔ جب اس نے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بابر کی طرف دیکھا تو بابر نے سمجھ لیا۔ واقعی اس کی نظریں دور تک جاتی ہیں اور دور تک صحیح دیکھتی ہیں۔

بابر نے اپنا تعارف کرایا۔ بہروز نے کہا۔ ''میری کار میں خرابی پیدا ہو گئی ہے اور وہیں یہ پرچی مجھے ملی ہے۔ اس میں آپ کے گیراج کا پتہ درج ہے۔''

بابر نے کہا۔ ''مجھے میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ آپ کے ساتھ یہ ہو چکا ہے اور آپ پہلے آدمی نہیں ہیں اس سے پہلے بھی میرے پاس کئی بڑی بڑی کاروں والے شکایتیں لے کر آئے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ کاروباری دشمنی ہے۔ ہمارے مقابل جو موٹر گیراج کے مالکان ہیں۔ وہ ایسی اوچھی حرکتیں کرتے ہیں اور ہمیں بدنام کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔''

بہروز نے پوچھا۔ ''اور آپ بدنام ہوتے رہتے ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نہایت ہی شریفانہ انداز میں جوابی کارروائی کرتے ہیں۔ چلئے، میں آپ کی کوٹھی تک چلتا ہوں۔ وہاں آپ کی گاڑی درست کر دوں گا اور اس کا معاوضہ ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ دشمن میری جوابی کارروائی کو خوب سمجھتے ہیں اور میں بھی اپنی شہرت اور نیک نامی کو قائم رکھنا جانتا ہوں۔''

بہروز گفتگو کے دوران شمشاد کو عجیب نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''یہ لڑکا کون ہے؟''

بابر نے جواب دیا۔ ''اس چھوکرے کو میں نے رکھا ہے۔'' اس نے لفظ 'رکھا' ہے پر زور دیا۔

بہروز نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اتنے اچھے لڑکے کو صرف کھانے پینے پر رکھا ہے؟''

بابر نے کہا۔ ''اچھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے میری غیر موجودگی میں اس کی تنخواہ وغیرہ بھی معلوم کر لی ہے، پوری معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ پھر بھی آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ بائی دی وے، ویسے آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہیں لینا چاہئے۔ آپ کی کار خراب ہوئی ہے۔ چلئے، میں ٹھیک کر دیتا ہوں۔''

بہروز نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''کار تو کسی وقت بھی ٹھیک ہو سکتی ہے مگر آپ شمشاد کو ساتھ لے چلیں۔ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ شمشاد کو ساتھ لے کر بہروز کے پیچھے چلتا ہوا گیراج سے باہر آیا۔ باہر ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ایک تگڑا سا جوان بیٹھا ہوا تھا۔ صورت سے چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ بہروز اور بابر اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اگلی سیٹ پر شمشاد بیٹھ گیا۔ پھر ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

بہروز نے بابر سے کہا۔ ''میں آپ کی غیر موجودگی میں شمشاد سے باتیں کر چکا ہوں۔ یہ اپنی زندگی میں ترقی کرنا چاہتا ہے۔ اپنا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔ میں اسے ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں یہ ہزاروں روپے کمایا کرے گا۔''

''میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرے ہی پاس رہے گا۔''

''لیکن شمشاد خود رہنا نہیں چاہتا۔''

شمشاد نے کہا۔ ''ہاں، میں یہ موٹر مکینک کا کام چھوڑ کر بہروز صاحب کے پاس رہوں گا۔''

بابر نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم بے وقوف ہو کیا تم جانتے ہو کہ مسٹر بہروز تمہیں کہاں لے جائیں گے۔ تم سے کیا کام لیں گے تمہارا کیا انجام ہوگا، تم ابھی نادان ہو۔ کم عمر ہو۔ جو فیصلہ میں تمہاری زندگی میں کروں گا وہی بہتر ہوگا۔''

شمشاد نے کہا۔ ''گاڑی روک دو۔''

گاڑی رک گئی، شمشاد نے دروازہ کھول کر اترتے ہوئے کہا۔ ''بہروز صاحب، میں آپ کے دیئے ہوئے پتے پر پہنچ جاؤں گا، خدا حافظ۔''

بابر نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''رک جاؤ۔''

اسی وقت اس کے پاس بیٹھے ہوئے بدمعاش نے بابر کے بازو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ بابر اس سے الجھتا، اسے ایک ریوالور دکھائی دیا۔ بابر ایکدم سے ساکت ہو گیا۔ اس بدمعاش نے کہا۔ ''اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو خاموشی سے بیٹھے رہو۔''

بابر کو خاموشی سے بیٹھنا پڑا۔ اگلی سیٹ کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔

بہروز نے کہا۔ ''تم بہت چالاک بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر پڑا ہوا ہے۔'' وہ ذرا چپ ہوا۔ آدھے فریم کی عینک کو اپنی ناک پر درست کیا۔ ''میں نے شمشاد سے سب کچھ اگلوا لیا ہے، تم نے اپنے ایک نوجوان کاریگر کو میری کوٹھی میں کار خراب کرنے کے لئے بھیجا تھا۔''

بابر نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''یہ جھوٹ ہے۔''

''یہ سچ ہے۔ میں جتنی دیر دفتر میں بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہا اتنی دیر میں، میں نے شمشاد کو پھانس لیا۔ اسے بڑے سہانے سپنے دکھائے ہیں، بہت زیادہ آمدنی کا لالچ دیا ہے۔ ایسے میں وہ تمہارا پول کیسے نہ کھولتا۔ اپنی ڈھٹائی سے باز آجاؤ اور صاف صاف بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں بھلا تم سے کیا چاہوں گا؟''

''مجھے شمشاد نے بتایا ہے کہ آج سے پہلے تم نے یا تمہارے گیراج کے کسی آدمی نے کسی کی گاڑی یوں چپکے سے خراب نہیں کی۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟''

''میں نے تمہاری گاڑی خراب نہیں کرائی ہے۔ اگر ایسا کراتا تو اس کی وجہ بھی بیان کرتا۔''

''دیکھو بابر، اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی، بہت گہری وجہ ہے جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ اس لئے میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ سچ سچ بتا دو۔ دیکھو گاڑی شہر کی حدود سے باہر نکل گئی ہے، اب ہم ایسے ویرانے میں پہنچنے والے ہیں جہاں سے تمہاری لاش اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

بابر نے کھڑکی کے پار دیکھا، چاروں طرف جنگل ہی جنگل نظر آ رہا تھا۔ اس کے درمیان پختہ سڑک پر وہ گاڑی دوڑتی جا رہی تھی، اس نے کہا۔ ''شمشاد ایک نادان اور کچے ذہن کا چھوکرا ہے، اس نے جب یہ دیکھا کہ تمہارے پاس اس کی ترقی ہو سکتی ہے۔ اس کی آمدنی بڑھ سکتی ہے تو اس نے تمہیں خوش کرنے کے لئے پتا نہیں میرے بارے میں کیا الٹی سیدھی ہانک دی ہے، میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کی ہے۔ بھلا میرا تمہارا کیا واسطہ ہے؟ کبھی ہم ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں رہے۔''

بہروز نے کہا۔ ''یہی بات تو مجھے الجھا رہی ہے۔ تم میرے لئے قطعی اجنبی ہو میرے

دشمن کس لئے بن سکتے ہو، ہاں، ایک بات دماغ میں آرہی ہے۔ سچ سچ بتاؤ کیا کسی خسرے سے تمہاری واقفیت ہے۔''

اس بار بابر ذرا چونک گیا۔ ہچکچانے لگا۔ بہروز اپنی آدھی عینک کے اوپر سے اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''یقیناً کسی خسرے سے تمہاری واقفیت ہے اور اس نے تمہیں میرے خلاف بھڑکایا ہے۔''

بابر نے پوچھا۔ ''کوئی خسرا کسی کو تمہارے خلاف کیوں بھڑکا سکتا ہے۔ تمہارا کسی خسرے سے کیا تعلق ہے۔''

بہروز نے سخت لہجے میں کہا۔ ''سوال میں کر رہا ہوں۔ تم جواب دو۔ مجھ سے سوال نہ کرو۔''

''میری کسی خسرے سے واقفیت نہیں ہے۔ میں ایسوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

ٹیکسی کے اندر خاموشی چھا گئی۔ بہروز سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگتی جا رہی تھی پھر ایک جگہ اس کی رفتار سست ہوگئی اور وہ پکے راستے کو چھوڑ کر کچے راستے پر مڑ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور یقیناً بہروز کا آدمی تھا۔ اسی لئے کسی حکم یا ہدایت کے بغیر اپنی مرضی سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ اسے منزل کا پتا تھا کہ کہاں جانا ہے۔

پھر وہ منزل آگئی۔ جنگلی جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک کھنڈر نما عمارت نظر آئی۔ بابر نے سمجھا یہی منزل ہے لیکن گاڑی اس عمارت سے آگے بڑھ گئی۔ ذرا فاصلے سے ایک گرجا نما عمارت نظر آ رہی تھی جو اونچی اونچی جھاڑیوں کے درمیان نصف چھپی ہوئی تھی۔ گاڑی وہاں پہنچ کر رک گئی۔ ریوالور والے نے کہا۔ ''اب ہم گاڑی سے باہر نکل رہے ہیں۔ تم کوئی چالاکی نہ دکھانا، ہمارے خلاف کوئی حرکت کرو گے۔ حملہ کرنے کی کوشش کرو گے تو جان سے جاؤ گے۔''

اس نے محتاط انداز میں اپنی طرف کا دروازہ کھولا پھر بابر کو ریوالور کے نشانے پر رکھتا ہوا باہر نکلا۔ بابر کو بھی اس کے بعد باہر آنا پڑا۔ گرجا نما عمارت سے چار آدمی نکل کر دوڑتے ہوئے گاڑی کی طرف آرہے تھے۔ کچھ گاڑی کی آواز، کچھ دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک ایسی تھی کہ اسی وقت دو چمگادڑیں اڑتی ہوئی کہیں سے آئیں اور ادھر ادھر دن کی روشنی میں بھٹکنے لگیں۔ پھر ایک طرف جھاڑیوں میں جا کر گم ہوگئیں۔

چمگادڑوں کو دیکھ کر بابر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ویرانہ ہو اور کھنڈر نما عمارتیں ہوں پھر ان کے قریب ایک چھوٹے سے قلعے کی طرح ایک گرجا گھر ہو اور وہ بھی غیر آباد ہو اور وہاں سے چمگادڑیں اڑتی ہوں تو وہ سارا کا سارا ماحول پُراسرار بن جاتا ہے۔

گرجا سے نکل کر آنے والے چاروں آدمیوں نے بابر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بہروز نے کہا۔ ''بابر، اب بھی وقت ہے، مجھے سچ سچ بتا دو تم نے یہ شرارت کیوں کی؟''

''مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا ہوں، اگر جھوٹ کہتا تو اپنی زندگی کے لئے، اپنی سلامتی کے لئے اپنے بیان میں تبدیلی کر دیتا لیکن جو سچ ہے اس کے بعد اور کیا سچ کہوں۔''

ریوالور والے نے کہا۔ ''ماسٹر یہ ایسے نہیں مانے گا۔ آپ حکم دیں تو ہم اسے خوب اذیتیں پہنچائیں اور اسے سچ بولنے پر مجبور کر دیں یا پھر اس کا کام تمام کر دیں۔''

بہروز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''جب تک مجھے اس کی شرارت کی وجہ معلوم نہیں ہو گی، میرے اندر بے چینی رہے گی، پتا نہیں میرے ساتھ یہ شرارت اس شخص نے کیوں کی، ضرور کوئی بات ہے۔ جب تک وہ بات نہیں معلوم ہو گی میں اسے گولی مارنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آج اسے لے جا کر بند کر دو۔ ہم شہر جا کر کل تک یہ معلوم کریں گے کہ اس کے ملنے جلنے والے کون لوگ ہیں۔ ان کے ذریعے ہمیں اس کی مصروفیات کا، اس کے مزاج کا اور شاید اس کی سازش کا پتا چل جائے۔''

دو آدمیوں نے دو طرف سے بابر کے بازوؤں کو سختی سے جکڑ لیا۔ پھر اسے کھینچتے ہوئے لے جانے لگے دو آدمی اس کے آگے چل رہے تھے۔ ریوالور والا پیچھے تھا۔ گرجا کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک چھوٹا سا قلعہ ہے۔ وہاں کی دیواریں بوسیدہ اور کہیں کہیں سے شکستہ تھیں، لکڑیوں کے پرانے دروازے اور سلاخوں والی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے ایک ایسے کمرے میں بند کیا گیا جہاں سلاخوں والی کھڑکی تھی۔

اس تمام عرصے میں وہ خاموش رہا۔ اس نے بہروز کی زیادتی پر اعتراض نہ کیا، صرف اپنے بیان پر ڈٹا رہا۔ وہاں قید ہونے میں اس کی نیم رضامندی شامل تھی، وہ قیدی کی حیثیت سے وہاں کے پُراسرار ماحول کو سمجھنا چاہتا تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس آ گیا اور سلاخوں کو تھام کر باہر دیکھنے لگا۔ سامنے کھلے میدان کی

طرح جگہ خالی تھی اس کے بعد پھر کچھ بڑے بڑے کمرے نظر آ رہے تھے۔ ان کمروں کے آگے چوڑا برآمدہ تھا، وہ پانچوں اسے قید کرنے کے بعد کھلے میدان سے گزرتے ہوئے قلعے کے گیٹ تک گئے تھے۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

قلعے کے دوسرے حصے میں دو عورتیں بہت دور نظر آئیں، وہ نرس کے لباس میں تھیں، عورتوں کو وہاں دیکھ کر بابر کو بڑی حیرانی ہوئی لیکن یہ حیرانی جلد ہی دور ہو گئی۔ جب وہ ذرا قریب آئیں تو پتا چلا کہ وہ خسرے ہیں۔ مردانہ شہر کے ہسپتال میں اب یہی خسرے نرس کے فرائض انجام دیتے تھے۔

وہ مٹکتے ہوئے، برآمدے سے گزرتے ہوئے کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے اسی وقت ایک بڑے سے کمرے کا بڑا سا دروازہ کھلا۔ وہاں سے ایک ڈاکٹر باہر آیا۔ اس نے ایپرن پہن رکھی تھی سر پر کپڑا بندھا ہوا تھا، گلے میں ایک ایسی پٹی لٹک رہی تھی جو آپریشن کے وقت ناک اور منہ پر باندھی جاتی ہے۔ اس کے ایپرن پر کہیں کہیں خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے، وہ ایک کپڑے سے ہاتھ پونچھتا ہوا، برآمدے سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی ایک نرس نظر آ رہی تھی۔

بابر حیرانی سے سوچ رہا تھا، کیا یہاں ہسپتال قائم کیا گیا ہے لیکن شہر سے اتنی دور ویرانے میں ٹی بی کے مریضوں کے لئے سینی ٹوریم قائم کیا جا سکتا ہے یا کسی مہلک مرض کے لئے ہسپتال قائم ہوتے ہیں۔ یہ کس قسم کا ہسپتال ہے؟ ایسا سوچنے کے دوران اس نے پھر چونک کر سامنے اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ ڈاکٹر نکل کر گیا تھا۔ اب اسی دروازے سے چار آدمی ایک سٹریچر اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔ اس سٹریچر پر کوئی لیٹا ہوا تھا، اس پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ وہ لوگ اس سٹریچر کو برآمدے سے اتار کر کھلے میدان سے گزرتے ہوئے دوسرے ہال کی طرف لے جا رہے تھے۔ شاید وہاں مریضوں کے لئے وارڈ بنائے گئے تھے۔

ایک کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ بابر ایک دم سے پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پچھلی دیوار میں جو لکڑی کا دروازہ تھا۔ وہیں سے وہ آواز سنائی دی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس دروازے کے پاس آیا۔ پھر کان لگا کر سننے لگا۔ دوسری طرف سے کچھ ایسی آوازیں سنائی دی تھیں جس کی وہ وضاحت نہیں کر سکتا تھا اس نے آہستگی سے پوچھا۔ ''ادھر کون ہے؟''

جواب میں خاموشی رہی۔ بابر نے دروازے پر دستک دی اور سوال کیا۔ ''کیا دروازے کی دوسری طرف کوئی موجود ہے؟''

اسے جواب ملا۔ ''ہاں، میں ایک قیدی ہوں اور میرا اندازہ ہے کہ تمہیں ابھی یہاں قید کیا گیا ہے، میں نے اس کمرے میں تھوڑی دیر پہلے کچھ آوازیں سنی تھیں۔''

بابر نے دروازے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ایک طرف ایک بڑی سی چٹخنی لگی ہوئی تھی، اس نے پوچھا۔ ''کیا دروازہ تمہاری طرف کھل سکتا ہے۔''

جواب ملا۔ ''میں نے اپنی طرف کی چٹخنی گرادی ہے۔ تم اُدھر سے کھولو۔''

دوسرے ہی لمحے بابر نے چٹخنی نیچے گرادی۔ دروازہ کھل گیا۔ اس کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا ہوا تھا، اس کے چہرے پر پریشانیوں کی وجہ سے جھریوں کا احساس ہوتا تھا حالانکہ چہرہ جھریوں سے خالی تھا مگر سکڑا ہوا تھا۔ سہا ہوا تھا۔ پریشان تھا۔

بابر نے پوچھا۔ ''کیا تم بھی قیدی ہو؟''

اس نے بابر کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہاں، چار دن سے یہاں ہوں۔ آج پانچواں دن ہے۔ وہ میرے بچے کو لے گئے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں لے گئے۔ کچھ نہیں بتاتے۔ میں دن رات روتا رہا۔ اب آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔ بس اب ایک ہی خواہش ہے، اپنے بیٹے کو صحیح سلامت دیکھوں اور خوشی سے مرجاؤں۔''

''تم باپ بیٹے ان لوگوں کے جال میں کیسے پھنس گئے؟''

''کیا بتاؤں۔ میں نے تو بہت کوششیں کی تھیں، اپنے بیٹے کو مجرموں سے بچانے کے لئے۔ اس کے ساتھ سکول تک جاتا تھا اور چھٹی کے وقت سکول سے اسے گھر لے کر آتا تھا۔ تم نے آئے دن اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ سکولوں اور کالجوں سے نوجوان لڑکے غائب کردیئے جاتے ہیں۔ اغوا کئے جاتے ہیں، ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ انہیں آسمان کھا گیا ہے یا زمین نگل گئی ہے۔ کئی بار اخبار میں پڑھا ہے کہ گمشدہ بچے اگر مل جاتے ہیں تو ان کی خصلت بدل جاتی ہے، وہ نشے کے عادی ہو جاتے ہیں اور خود کو مرد سے زیادہ عورت کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، کچھ ایسے گمشدہ لڑکے بھی نظر آئے جو مکمل خسرے بن گئے تھے۔ میں حیران ہوں، پریشان ہوں۔ یہ ہماری تہذیب کدھر جارہی ہے۔'' اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگا۔ ''میرا بیٹا! کہاں ہے میرا بیٹا۔ میں جب سرحدی

بستی میں اس کی ماں سے ملنے جاؤں گا تو اس سے کیا کہوں گا کہ میں نے بیٹے کو کہاں گم کر دیا ہے۔ وہ یقیناً زندہ ہوگا مگر مُردوں سے بدتر ہوگا۔'' وہ اپنے بچے کے لئے ایک بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

بابر کا سر جھک گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا کرے۔ اس بات کو کیسے سمجھائے کہ ہماری مردانہ تہذیب نے ایک نہیں بے شمار جوان بچوں کو نگل لیا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر اس کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دیوار میں ایک اور دروازہ نظر آیا۔ وہ بھی لکڑی کا تھا، اس نے آگے بڑھ کر اسے ذرا سا ہلایا، دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ اس نے زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے۔ کی ہول سے ایک آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا کمرہ نظر آیا۔ کمرے کی سامنے والی دیوار پر بڑے بڑے ریک بنے ہوئے تھے اور ان میں بے شمار فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی ایک بڑی سی میز تھی۔ پھر اسے کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ اس کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر وہ دروازہ بند ہوا۔ دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ بابر نے بہروز کی آواز پہچان لی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رئیس احمد کے باپ کو یہاں لے آؤ۔ میں اس سے کچھ باتیں کروں گا۔''

بابر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے ادھیڑ عمر کے آدمی کے پاس آکر سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا تمہارے بیٹے کا نام رئیس احمد ہے؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا، بابر نے کہا۔ ''دیکھو، وہ لوگ تمہیں لینے آرہے ہیں۔ اس دروازے کو یوں بند کرو اور چٹخنی کو یوں اوپر چڑھاؤ کہ جب میں دوسری طرف سے کھولنا چاہوں اور دروازے کو جھٹکا دوں تو چٹخنی نیچے گر پڑے۔ زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ جو کہتا ہوں وہی کرنا۔''

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولتے ہوئے، دوسری طرف اس کمرے میں آگیا جہاں پہلے اسے قید کیا گیا تھا اس نے دروازے کو اپنی طرف سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

چند لمحوں کے بعد دوسرے کمرے میں کچھ آوازیں سنائی دیں وہ کان لگا کر سننے لگا۔ آنے والا رئیس احمد کے باپ سے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ بابر نے جھک کر اس دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ وہ کمرہ خالی نظر آیا۔ اس کمرے کا دوسرا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی طرف کی چٹخنی گرائی، دروازے کو ہلکے سے جھٹکا دیا۔ دوسری طرف کھٹ کی آواز سنائی دی۔ چٹخنی اپنی جگہ سے ہل کر نیچے ہو گئی تھی۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس کمرے میں آیا۔ پھر اس کمرے کے دوسرے دروازے تک پہنچا۔ دوسری طرف باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بہروز کہہ رہا تھا۔ ''اپنے بیٹے کو یا تو بھول جاؤ۔ سمجھ لو کہ وہ مر چکا ہے اور اگر اس کی زندگی چاہتے ہو۔ اسے دیکھنا چاہتے ہو تو جس روپ میں ہم دکھائیں اسے قبول کرلو۔''

ایک باپ کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں تم اسے کس روپ میں دکھاؤ گے۔ میں نے اخباروں میں پڑھا ہے۔ خود اپنی آنکھوں سے ایک ایسے لڑکے کو دیکھا ہے جسے بہت پہلے اغوا کیا گیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو ہماری تہذیب کے لئے ایک گالی بن چکا تھا۔''

بہروز نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بعض حالات میں انسان کو مجبوراً گالی سننا پڑتی ہے اور گالی سن کر زندہ رہنا پڑتا ہے کیونکہ زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے۔ تمہاری اپنی زندگی اپنے لئے قیمتی ہو یا نہ ہو، اپنے بیٹے کے لئے، اپنے بیٹے کی ماں کے لئے قیمتی ہے۔ تم خودکشی نہیں کر سکتے۔ تمہارا بیٹا تمہیں جس روپ میں ملے گا۔ تم اسے ہلاک نہیں کر سکو گے۔ اسے ہر حال میں گلے لگاؤ گے۔''

''ہاں وہ میری اولاد ہے، جیسی بھی ہوگی گلے لگاؤں گا۔ تم بہت ہی ذلیل انسان ہو، تم والدین کی کمزوری کو سمجھتے ہو اور ان کے معصوم بچوں کی زندگی سے کھیلتے ہو، تمہیں آخر کیا ملتا ہے؟''

ایک قہقہہ سنائی دیا۔ اس قہقہے کے بعد بہروز نے کہا۔

''میں ڈیمانڈ اور سپلائی کی تھیوری پر عمل کر رہا ہوں اور اس شہر کا رئیسِ اعظم بنتا جا رہا ہوں۔ چند برسوں میں میرے پاس اتنی دولت ہوگی جس کا شمار نہیں ہوگا۔''

''کیا یہ دولت تم اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤ گے؟''

پھر ایک قہقہہ سنائی دیا۔ بہروز نے کہا۔ ''یہ بہت پرانی بات ہے۔ کوئی اپنی قبر میں کچھ نہیں لے جاتا مگر جب تک قبر سے باہر رہتا ہے، دولت سمیٹتا ہے اور اس دنیا کو اپنے لئے جنت بناتا ہے، میری بات چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔ یاد رکھو جو ہمارے اس علاقے میں آ

جاتا ہے وہ زندہ واپس نہیں جاتا، تمہارے کمرے کے برابر والے کمرے میں آج ایک قیدی آیا ہے۔ اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ میری ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ میں اپنے دشمن کو اس وقت تک نہیں مارتا۔ جب تک اس کے متعلق پوری معلومات حاصل نہ کر لوں۔ اگر دشمن مر جائے اور اس کی سازش کا علم مجھے نہ ہو، اس کا منصوبہ میرے سامنے کھل کر نہ آئے تو میں اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ میرے اندر اضطراری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں سکون سے نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس شخص کی زندگی آج رات تک کی ہے، اسے کل دیکھا جائے گا۔ میں تمہارے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں بولنے لگا۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا جو لوگ یہاں آتے ہیں۔ وہ زندہ واپس نہیں جاتے، اگر میں تمہیں یونہی جانے دوں تو تم میرے خلاف شہر میں جا کر محاذ بناؤ گے قانون کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو گے۔''

مجبور باپ کی آواز سنائی دی۔ ''میں تمہارے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالوں گا۔ میں پہلے بھی کسی کا دشمن نہیں تھا اور نہ ہی میں نے آج تک کسی کو دشمن بنایا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، میرا بیٹا مجھے واپس کر دو۔ میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''تمہارا بیٹا تمہیں سال چھ ماہ کے بعد واپس مل جائے گا وہ ابھی تربیت حاصل کر رہا ہے۔ تم سرحدی بستی میں جا کر اپنی بیوی کو یہ تسلی دے سکتے ہو کہ تم نے اپنے بیٹے کو تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر بھیج دیا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''لیکن سال چھ ماہ کے بعد کیا ہوگا؟''

''تمہارا بیٹا تمہیں واپس مل جائے گا۔ ہم کوالٹی کے مطابق کمیشن لیتے ہیں تمہارا بیٹا سپر کوالٹی کا حامل ہے اس لئے اس سے بیس فیصد کمیشن لیا جائے گا اور وہ راضی خوشی ہمیں یہ کمیشن دیا کرے گا۔ تم سے ہمارا کوئی معاملہ نہیں ہے۔''

باپ کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تم کیسی باتیں کر رہے ہو، صرف اپنے فائدے کی سوچ رہے ہو، یہ تو سوچو، ایک ماں کو جب اپنے بیٹے کی حقیقت معلوم ہوگی تو اس پر کیا گزرے گی۔''

''ہم تم چاہیں تو اس کی ماں کو بیٹے کی حقیقت کبھی نہیں معلوم ہوگی۔ وہ بیٹا ہی بن کر ماں کے پاس جایا کرے گا مگر ہاں، خبردار تمہاری زبان ہمارے خلاف کوئی بات نہیں اگلے

گی۔تم قانون کا سہارا لینا چاہو گے تو تمہارے بیٹے کا راز فاش کر دیا جائے گا۔تمہاری بیوی بھی یہ جاننے کے بعد زندہ نہ رہ سکے اور تم سوسائٹی میں منہ نہ دکھا سکو، یہ لو، اس فائل کو ذرا دیکھ لو۔"

اس کے ساتھ ہی میز پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی جیسے بہروز نے اس کے سامنے کوئی فائل پھینکی ہو، پھر بہروز کی آواز سنائی دی۔"اپنے بیٹے رئیس احمد کا نام بھول جاؤ، اب یہ فائل رئیسہ بانو یا رئیسہ بیگم کے نام سے شروع ہو رہی ہے۔اسی نام سے اب اسے نئی شہریت حاصل ہو گی، اسی نام سے اس کا شناختی کارڈ بنایا جائے گا اور رفتہ رفتہ اس کے ضروری کاغذات اسی نام کے حوالے سے تیار ہوتے رہیں گے۔یہ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی فائلوں کو دیکھ رہے ہو، یہ سب اسی قسم کی ہیں۔تمام راز یہاں دفن ہیں اور یہیں سے ایسے لوگوں کو نئی شہریت حاصل ہوتی ہے اور یہ سب کچھ ہم کراتے ہیں۔"

یہ سن کر بابر کا دل اس خیال سے دھڑکنے لگا کہ راحت جان کی فائل بھی اسی کمرے میں ہو گی۔وہ اپنی کوشش میں ناکام نہیں رہا تھا۔صحیح مقام تک پہنچ گیا تھا۔دوسری طرف وہ مجبور باپ ایک سرد آہ بھر کر کہہ رہا تھا۔"آہ! کاش سکول کی چھٹی کے وقت میری گاڑی خراب نہ ہوتی۔اب سمجھ میں آ رہا ہے۔شاید تبھی لوگوں نے میری گاڑی میں کوئی خرابی پیدا کی ہو گی تاکہ مجھے اور میرے بیٹے کو لفٹ دے سکو۔یہ میری بدبختی تھی کہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ تمہاری گاڑی میں بیٹھ گیا اور یہاں آنے پر مجبور ہو گیا۔"

بہروز نے کہا۔"اب گزری ہوئی باتوں کو یاد کر کے اپنا سینہ پیٹنے اور سر کے بالوں کو نوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا، جو کچھ میں نے کہا ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو۔کل تمہارے بیٹے سے کسی وقت تمہاری ملاقات کرائی جائے گی۔وہ ابھی زیرِ علاج ہے، کچھ عرصے تک یہاں رہے گا۔اس کے بعد ہر ماہ تم ایک بار اس سے مل سکو گے۔ہم تمہارے رشتوں کے درمیان کبھی دیوار نہیں بنیں گے، تم ہمارے لئے گڑھا کھودنے کی حماقت نہ کرنا۔اب جاؤ۔"

بابر سمجھ گیا کہ وہ اس کمرے میں آنے والے ہیں۔وہ فوراً پلٹ کر دبے قدموں چلتا ہوا اپنے قید خانے میں آیا، پھر اس نے دروازے کو بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔اب اسے اپنی

آنکھوں کے سامنے موت نظر آ رہی تھی۔پہلے وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔پہلے زندگی بے مقصد تھی۔عورت کے بغیر خالی تھی۔پہلے مرنا آسان تھا مگر اب درخشاں نے اس کی سوچ میں پھول کھلا دیئے تھے۔خوشبوئیں بھر دی تھیں، راحت جان کے بعد درخشاں کو دیکھ کر گوبھی اور گلاب کے پھول کا نمایاں فرق سمجھ میں آ گیا تھا۔

درخشاں کا حسن و شباب، اس کی مسکراہٹ، اس کی شرم و حیا اور اس کے جلوے کا ذرّہ ذرّہ اسے سمجھا رہا تھا کہ انسان کو اپنی طبعی عمر تک جینا چاہئے زندگی کے حسن کو خود بھی سمجھنا چاہئے، دوسروں کو بھی سمجھانا چاہئے۔

وہ کمرے میں ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا۔درخشاں کا تصور اس کے اندر جینے کا عزم اور حوصلہ پیدا کر رہا تھا۔وہ اس کے بھائی راحت بیگ یا راحت جان کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ایک بھائی کو بہن سے اور ایک بیٹے کو ماں سے ملانا چاہتا تھا۔وہاں قیدی بننے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ وہ ایسی تمام فائلیں دیکھ چکا تھا جن کے ذریعے بہروز، راحت جان جیسی مخلوق کو بلیک میل کر رہا تھا۔

اس کے دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا۔"کیا راحت جان کی فائل وہاں سے غائب کر دی جائے تو بہروز اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔پھر بلیک میل نہیں کرے گا؟"

اس کے دماغ نے جواب دیا۔"یقیناً پھر بھی وہ بلیک میل کر سکتا ہے۔وہ اپنے وسیع ذرائع استعمال کر کے درخشاں اور اس کی ماں کو راحت جان کی حقیقت بتا سکتا ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" بابر نے سوچنے کے دوران سگریٹ کی طلب محسوس کی اسے خیال آیا کہ اس نے بڑی دیر سے سگریٹ نہیں پیا ہے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ایک سگریٹ کو سلگایا پھر ایک گہرا کش لے کر سوچنے لگا۔

یہاں کی تمام فائلوں کو راحت جان کی فائل کے ساتھ اس طرح تباہ کر دیا جائے کہ بہروز کو شبہ نہ ہو، وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ سب کچھ صرف راحت جان کے لئے کیا گیا ہے۔اس نے دو چار بار کش لیا۔دھواں چھوڑتا رہا۔پھر ایک خیال آیا کہ ان فائلوں کو تباہ کرنے سے کیا فائدہ ہو گا۔مثلاً راحت جان کی فائل اگر جلا دی جائے تو اس کے بعد بھی بہروز اسے بلیک میل کر سکتا ہے۔اس کا راز فاش کرنے کی دھمکی دے سکتا ہے، اصل راز تو بہروز کے دماغ میں چھپے ہوئے ہیں، اس دماغ کو اگر ضائع کر دیا جائے تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ پھر سلاخوں کے پار دیکھنے لگا۔ اب باہر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، کہیں کہیں لالٹین کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے جس کمرے میں ایک ڈاکٹر کو جاتے دیکھا تھا وہاں پیٹرومیکس کی روشنی تھی۔ پھر اس نے بہروز کو دیکھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ چلتا ہوا قلعے کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ کھلے میدان سے گزرتے ہوئے وہ بابر کی طرف دیکھ کر رک گیا۔ پھر اس نے اپنے ماتحت سے لالٹین لے کر اسے سر سے اونچا کرتے ہوئے، بابر کی طرف روشنی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اپنی زندگی چاہتے ہو تو میرے آدمیوں کو بتا دینا کہ تم نے مجھے چھیڑنے کی جرأت کیوں کی تھی۔ نہیں بتاؤ گے اور مجھے الجھانا چاہو گے تو سمجھ لو، آج کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لالٹین اپنے ماتحت کو دی۔ پھر ان کے آگے آگے چلتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا جہاں سے پیٹرومیکس کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ وہاں سناٹا چھا گیا، جہاں وہ قید تھا۔ وہاں بھی تاریکی تھی۔ باہر بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اب اس گہرے اندھیرے میں درخشاں، کرن کرن جگمگا رہی تھی۔ اس کی شرمیلی ادائیں اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ وہ زندگی کی آخری رات گزار رہا تھا۔ درخشاں کتنی ہی رنگین اور سنگین راتوں کے لئے اسے حوصلے دے رہی تھی۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ پاس والے کمرے سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دروازے کے قریب گیا۔ دوسری طرف وہی ادھیڑ عمر کا شخص کبھی آہیں بھر رہا تھا، کبھی کچھ بڑبڑا رہا تھا اور کبھی رو رہا تھا۔ بابر دروازہ کھول کر اس کے پاس آ گیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اب رونے سے تقدیر نہیں بدلے گی۔ آپ بزرگوں نے جو بویا تھا وہ نئی نسل کاٹ رہی ہے۔''

اس نے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے بابر کو دیکھا پھر ندامت سے کہا۔ ''ہاں ہم نے غلطی کی۔ جو الگ الگ خانے میں دور دور تقسیم ہو گئے۔ ہم نے یہ نہیں سوچا کہ بازار میں چینی نایاب ہوتی ہے تو لوگ شکر استعمال کرتے ہیں۔ شکر نہ ملے تو مجبوراً گڑ استعمال کرنے لگتے ہیں، انسان اپنی عادت سے مجبور ہے۔ کوئی نہ کوئی متبادل راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نئی نئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ معاشرے میں گناہ اور جرائم کی نئی سمتیں نکل آتی ہیں، میں انگریزی دوا فروش ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے موجودہ

معاشرے میں ایسے مریض زیادہ ہیں جو بے راہ روی کا شکار ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو نشے کا سہارا لیتے ہیں مگر مہنگا نشہ نہیں خرید سکتے وہ خواب آور گولیاں کھائے بغیر سو نہیں سکتے۔'' اس نے اپنے سر کے بالوں کو نوچتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی مجرم ہوں۔ میں اپنی دکان کے چور دروازے سے نشہ فروخت کرتا رہا اور بھاری قیمتیں وصول کرتا رہا، میں نے خوب دولت کمائی ہے۔ ان پانچ برسوں میں انسان کی محرومیوں سے بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔ آہ! میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ سے بھی بڑے مجرم یہاں موجود ہیں، آج میرے ہوش اُڑ گئے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔''

بابر نے کہا۔ ''اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ اپنے جرم کا اعتراف کرو۔ قانون کے دروازے پر جاؤ، یہ نہ سوچو کہ تمہارے بیٹے کی ماں پر کیا گزرے گی۔ سوسائٹی میں اپنی بدنامی سے بھی نہ ڈرو۔ تمہارے بیٹے کی زندگی برباد ہو چکی ہے، قانون کا سہارا لے کر اعلان کر دو۔ بہروز خان کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ قانون کے محافظ یہاں چھاپہ ماریں گے۔ بہروز کو گرفتار کریں گے اور یہ قصہ کسی طرح ختم ہوگا۔ پھر شاید اس کے بعد کوئی دوسرا ایسے جرم کا ارتکاب نہ کر سکے۔ کرے گا تو آنے والا وقت اس کا بھی محاسبہ کرے گا مگر جو ہم کر سکتے ہیں وہ ہمیں کرنا چاہئے۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''نن۔ نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

بابر نے پوچھا۔ ''کیا اپنی بدنامی سے ڈرتے ہو؟''

''نہیں میں اپنی بیوی سے ڈرتا ہوں بلکہ اس کے سامنے مجھے ندامت محسوس ہوگی۔ جب عورتوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ہم نے انہیں الگ کرنے کے بعد یہاں کیا گل کھلایا ہے اور اپنی تہذیب کو کس طرح شرمناک بنا رہے ہیں تو تم خود سوچو کہ ہماری کتنی بے عزتی ہوگی، توہین ہوگی۔ نہیں، میں اپنی بیوی تو کیا کسی بھی عورت کے سامنے حقیقت کو تسلیم نہیں کروں گا۔ بہروز کو بے نقاب نہیں کروں گا۔''

بابر اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ کوئی تدبیر سوچتا رہا کہ کس طرح وہاں سے نکلے پھر وہ قیدیوں کی فطرت کے مطابق سلاخوں والی کھڑکی کے پاس آ گیا اور سلاخوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر ہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکیاں پرانی تھیں۔ سلاخیں زنگ آلود ہو رہی تھیں۔ انہیں ہلانے سے وہ ہلتی تھیں لیکن

لکڑی کی چوکھٹ میں اندر تک دھنسی ہوئی تھیں، کوئی بہت ہی شہ زور پہلوان ہوتا تو شاید اس کھڑکی کو ہی چوکھٹ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا۔

وہ پہلوان نہیں تھا لیکن کمزور بھی نہیں تھا۔ دو سلاخوں کو مٹھی میں جکڑ کر ہلانے لگا۔ کبھی آہستہ آہستہ اور کبھی زور زور سے، آس پاس دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس قلعے میں زیادہ لوگ نہیں رہتے تھے یا انہیں اطمینان تھا کہ جو دو قیدی وہاں رکھے گئے ہیں، وہ اس قلعے سے نہیں نکل سکیں گے۔

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کے پیکٹ اور لائٹر کو نکال کر ایک سگریٹ سلگایا۔ پھر سلگتے ہوئے سگریٹ کے دو ٹکڑے کیے۔ اس نے سلگتے ہوئے حصے سے دوسرے ٹکڑے کو بھی سلگایا۔ پھر دونوں سلگتے ہوئے ٹکڑوں کو سلاخ کے نچلے حصے میں اس جگہ رکھا جہاں وہ سلاخ چوکھٹ میں دھنسی ہوئی تھی۔ پھر اس نے دوسرے سگریٹ کو سلگا کر اسے بھی دو حصوں میں تقسیم کیا اور دونوں حصوں کو سلگا کر وہیں دوسرے سلگتے ہوئے ٹکڑوں کے ساتھ رکھ دیا اور انتظار کرنے لگا۔ اس جگہ کی لکڑی آہستہ آہستہ آگ سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ کبھی کھڑکی کے باہر محتاط نظروں سے دیکھتا جاتا تھا۔ کبھی ایک ایک ٹکڑے کو اٹھا کر کش لگاتا تھا تاکہ آگ جلتی رہے۔ پھر اس ٹکڑے کو اسی جگہ رکھ دیتا تھا۔ اس طرح کسی ٹکڑے کو بجھنے نہیں دے رہا تھا، جس کی آگ دم توڑنے لگتی تھی اسے اٹھا کر کش لگا کر پھر اس آگ کو زندہ کر کے وہیں رکھ دیتا تھا۔

پھر وہ چاروں ٹکڑے سلگتے سلگتے ختم ہونے لگے تھے۔ اس نے مزید دو سگریٹ سلگائے۔ ان کے چار ٹکڑے کیے پھر انہیں بھی اسی طرح وہاں رکھ دیا۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ کوشش میں ذہانت بھی شامل ہو تو خاطر خواہ کامیابی ہوتی ہے۔ اس نے آخر کار اس سلاخ کو پکڑ کر ذرا زور زور سے ہلایا۔ جہاں وہ دھنسی ہوئی تھی اس حصے کی لکڑی کو آگ نے کمزور کر دیا تھا۔ سلاخ کا نچلا حصہ لکڑی کو اُدھیڑتا ہوا نکل گیا۔ اس نے نیچے کی طرف سلاخ کھینچی تو اوپر جو حصہ دھنسا ہوا تھا وہ بھی نکل آیا۔

اس نے خوش ہو کر سلاخ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تولا۔ اب اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے سلاخوں کے درمیان سر ڈال کر کھڑکی کے باہر ادھر اُدھر دیکھا۔ دائیں بائیں برآمدے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ ان سلاخوں کے درمیان

سے گزر کر کھڑکی کے باہر آ گیا۔ برآمدے میں دبے قدموں چلتے ہوئے اسے خیال آیا۔ اگر وہ محتاط انداز میں چوروں کی طرح چلتا رہے گا تو دور سے کوئی دیکھنے والا اس پر شبہ کرے گا۔

وہ ایک جگہ رک گیا۔ ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر سوچنے لگا۔ یہاں سے وہاں تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں لالٹین کی روشنی تھی۔ کوئی اسے دور سے پہچان نہیں سکتا تھا لہٰذا وہ بے باکی سے چلتا ہوا برآمدے سے اتر کر کھلے میدان کو پار کرنے لگا۔ اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا۔ جہاں پیٹرومیکس کی روشنی نظر آ رہی تھی۔

اس کمرے میں بہروز ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کرسی کے پیچھے وہ بدمعاش کھڑا ہوا تھا جو بابر کو ریوالور کی زد پر یہاں تک لایا تھا۔ میز کی دوسری طرف ایک خوش پوش ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ بہروز اسے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ بابر نے کھڑکی سے جھانک کر انہیں دیکھا۔ پھر اچانک ہی دروازے کے پاس آ کر ایک زور کی لات ماری۔ دروازہ کھلا۔ وہ تینوں ہی چونک گئے پھر اس سے پہلے کہ وہ بدمعاش اسے دیکھ کر ریوالور نکالتا۔ بابر کا سلاخ والا ہاتھ پوری قوت سے گھوما، اس بدمعاش کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ بہروز اور ڈاکٹر، دونوں ہی سہم کر بابر کو دیکھ رہے تھے۔ بابر نے کہا۔ ''اگر خیریت چاہتے ہو تو شور نہ مچانا اور مجھ پر حملہ کرنے کی حماقت نہ کرنا۔''

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اس بدمعاش کے پاس گیا۔ دائیں ہاتھ سے سلاخ کو تھامے رکھا۔ بایاں ہاتھ اس نے بدمعاش کی پتلون کی جیب میں ڈالا اور وہاں سے ریوالور نکال لیا۔

اس نے کن انکھیوں سے ریوالور کا جائزہ لیا۔ اس کا چیمبر بھرا ہوا تھا، مطمئن ہونے کے بعد اس نے سلاخ کو ایک طرف پھینک دیا۔ ریوالور کو دائیں ہاتھ میں لیا۔ پھر اس کی نال بہروز کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے یہاں سے واپس لے جاؤ گے۔ کیا وہ ٹیکسی باہر موجود ہے؟''

اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ہاں ہاں موجود ہے۔ میں تمہیں ضرور لے چلوں گا۔ تم میرے دوست ہو۔ دیکھو میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے تو صرف

اس لئے تمہیں وہاں بند رکھا تھا کہ میں تمہارے بارے میں سچی باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔''

''بہروز سچی بات یہ ہے کہ تمہارے فیصلے کے مطابق آج کی رات میری زندگی کی آخری رات تھی۔ اب ریوالور میرے ہاتھ میں ہے لیکن میں تمہاری طرح خدائی دعویٰ نہیں کروں گا۔ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی تمہارا فیصلہ کرے گا۔ تم مجھے یہاں سے لے چلو اور کوئی چالاکی نہ دکھاؤ۔''

ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ وہ وہاں چپ چاپ کھڑا رہے گا۔

بابر بہروز کو اسی طرح لئے ہوئے پیچھے سے آگے بڑھتا ہوا دروازے سے نکلا۔ پھر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ ''اب میں تمہیں چھوڑتا ہوں۔ تم آگے چلو گے۔ میں پیچھے رہوں گا۔ میرا ریوالور والا ہاتھ جیب میں رہے گا۔ جیسے ہی تم کوئی چالاکی دکھاؤ گے۔ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔''

وہ اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ بابر نے ریوالور والا ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ قلعے کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اگر گیٹ کے پاس تمہارے ماتحت تمہارے پاس آئیں گے تو میں آگے بڑھ کر پھر تمہارے گریبان کو پکڑ لوں گا اور سب کے سامنے تمہیں ریوالور کی زد میں رکھ کر لے جاؤں گا۔''

گیٹ کے قریب وہی ہوا۔ بہروز کے دو ماتحت اس سے کچھ کہنے کے لئے قریب آنا چاہتے تھے۔ بہروز نے دور ہی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ابھی میں بہت مصروف ہوں۔ میرے قریب آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی واپس آ کر بات کروں گا۔''

وہ دونوں اپنی جگہ رک گئے۔ بہروز آگے بڑھتا رہا۔ بابر اس کے پیچھے اطمینان سے چلتا رہا۔

گیٹ پر موجود رہنے والے ماتحتوں کو کچھ شبہ ہوا جو تھوڑی دیر پہلے قیدی بنا کر لایا گیا تھا وہ ان کے ماسٹر کے پیچھے آزادانہ چل رہا تھا اور ماسٹر کسی سے کچھ نہیں بول رہا تھا۔ ایک ماتحت نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ماسٹر، کیا آپ نے اس قیدی کو رہا کر دیا ہے۔''

بہروز چلتے چلتے رک گیا۔ پھر پلٹ کر بولا۔ ''میرا شبہ دور ہو گیا ہے۔ مسٹر بابر اب

ہمارے دوست ہیں۔ آیئے، مسٹر بابر۔''

بہروز نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ بابر نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ماتحت مطمئن ہو کر واپس گیٹ کی طرف چلا گیا۔ بہروز نے ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ''دیکھو، میں تمہارے ساتھ تعاون کر رہا ہوں۔ میں چاہوں تو اشارتاً اپنے ماتحتوں کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔''

بابر نے کہا۔ ''کہہ کر اپنی حسرت مٹالو۔ میں ایک گولی چلانے کی حسرت پوری کر لوں گا۔''

ٹیکسی کے پاس ڈرائیور موجود تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر کدھر جانا ہے؟''

بہروز نے بابر کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ ''ہم شہر چلیں گے۔''

ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر پیچھے گئی۔ پھر ایک طرف سے گھوم کر کچے راستے پر سُست رفتاری سے چلنے لگی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد پکی سڑک آ گئی۔ وہاں اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ایک پولیس چوکی آئی تھی۔ وہاں پہنچ کر بابر نے کہا۔ ''یہاں گاڑی روکنے کے لئے کہو۔ ہم یہاں کے پولیس آفیسر سے ملاقات کریں گے۔''

بہروز نے مسکرا کر کہا۔ ''شاید تم مجھے قانون کے حوالے کرنا چاہتے ہو۔ میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔ اس وقت تمہارے قبضے میں ہوں۔ جو چاہو سلوک کرو۔''

ڈرائیور نے ان کی باتیں سن کر گاڑی کی رفتار سُست کر دی۔ پھر پلٹ کر کہا۔ ''کیا بات ہے ماسٹر۔ کیا یہ شخص ہمیں قانون کے حوالے کرے گا؟'' ایسا کہتے وقت اس نے بابر کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا تھا۔

بہروز نے کہا۔ ''تم ہمارے معاملات میں نہ بولو۔ میں جو حکم دے رہا ہوں وہی کرو۔ گاڑی پولیس آفیسر کے پاس لے چلو۔''

دس منٹ کے بعد وہ پولیس آفیسر کے سامنے تھے۔ بابر، بہروز کے جرائم سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ آفیسر توجہ سے سن رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''مسٹر بابر، یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مسٹر بہروز کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بہت ہی معزز انسان ہیں اور جس چھوٹے سے قلعے کی آپ باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ایک چھوٹا سا ہسپتال ہے۔ اسے ڈاکٹر نثار

نے قائم کیا ہے۔ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ میں انہیں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔''

بابر نے کہا۔ ''آفیسر، آپ نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے وہ فریبِ نظر بھی ہوسکتا ہے کیونکہ آپ وہاں وردی میں جاتے ہیں۔ وہاں کا نقشہ بدلا جاسکتا ہے لیکن میں سچ کہتا ہوں..........''

آفیسر نے بات کاٹ کر کہا۔ ''اگر آپ سچ کہتے ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں ہمارے پاس اتنے سپاہی نہیں ہیں کہ ہم اس جرائم کے اڈے کو چاروں طرف سے گھیر سکیں اور ہر ایک کو گرفت میں لے سکیں۔ اس کے لئے شہر سے امداد طلب کرنا ہوگی۔''

''تو پھر آپ فوراً امداد طلب کریں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس وقت وہاں تمام مجرم موجود ہیں اور گرفتار کئے جاسکتے ہیں۔''

آفیسر نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ پھر رابطہ قائم ہوتے ہی کہا۔ ''جناب میں چکوالی چیک پوسٹ سے باتیں کر رہا ہوں۔ یہاں ایک مسٹر بابر ہیں۔ انہوں نے مسٹر بہروز کو ریوالور کی زد میں لیا ہوا ہے اور انہیں مجرم سمجھ کر یہاں میرے پاس لائے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق ڈاکٹر نثار نے اس ویرانے میں جو ہسپتال قائم کیا ہے وہ جرائم کا اڈا ہے۔ اسے چاروں طرف سے گھیرنا چاہئے اور تمام مجرموں کو گرفتار کرنا چاہئے۔'' پھر وہ خاموش ہوکر دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ اس کے بعد اس نے ریسیور بابر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ بات کریں۔''

بابر نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ ''جناب میرا نام بابر ہے۔ میں ایک موٹر گیراج کا مالک ہوں۔ آپ کے آدمی وہاں آئیں گے تو میں اپنا مکمل تعارف کرادوں گا۔ اس وقت اس اڈے پر چھاپہ مارنا بے حد ضروری ہے ورنہ مجرم فرار ہوجائیں گے۔''

وہ اس قلعے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ دوسری طرف سے یقین دلایا گیا کہ جلد از جلد پولیس کی ایک جماعت بھیجی جارہی ہے۔ اس جماعت میں سپاہیوں کی تعداد اچھی خاصی ہوگی۔

بابر نے مطمئن ہوکر ریسیور رکھ دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد پولیس کی ایک بھاری جماعت وہاں پہنچی۔ وہ سب مسلح تھے۔ بابر ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بہروز کو

حوالات میں بند کردیا گیا تھا۔ جب گاڑی اس ویرانے کی طرف جانے لگی تو بابر نے اس پولیس پارٹی کے ساتھ آنے والے آفیسر کو تمام باتیں تفصیل سے بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ جب اسے قید کیا گیا تھا تو وہ کس طرح ایک سلاخ کو کھڑکی سے نکال کر باہر نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔

وہ باتیں کرتے ہوئے اس قلعے کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں لالٹین کی روشنیاں نظر آرہی تھیں اور وہی ایک پیٹرومیکس بھی روشن تھا۔ قلعے کا دروازہ پولیس کی گاڑی کے لئے کھول دیا گیا۔ پولیس کے پندرہ مسلح جوان اس چھوٹے سے قلعے کے چاروں طرف پھیلنے لگے۔ باقی جوان آفیسر اور بابر کے ساتھ اندر آئے۔ وہاں پہلے ڈاکٹر نثار سے ملاقات ہوئی۔ وہی ڈاکٹر تھا جس کے کمرے کے دروازے کو بابر، باہر سے بند کرکے گیا تھا۔ اس نے آفیسر اور پولیس والوں کو اپنے ہسپتال کا معائنہ کرایا۔ وہاں صرف چار مریض نظر آئے۔ آفیسر نے ان کے جسم سے چادریں ہٹا کر سر سے پاؤں تک ان کا معائنہ کیا۔ ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ جس سے کسی جرم کا پتہ چلتا۔ انہوں نے قلعے کے ایک ایک حصے کو دیکھا۔ پھر اس کمرے میں بھی گئے۔ جہاں بابر کو اور رئیس احمد کے باپ کو قید کیا گیا تھا۔ رئیس احمد کا باپ نظر نہیں آیا۔ ان دونوں کمروں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہاں کسی کو قیدی بنا کر رکھا گیا ہو۔ تیسرے کمرے میں جو فائلیں رکھی ہوئی تھیں اب وہاں دوائیں نظر آرہی تھیں۔ ایک کمپاؤنڈر وہاں اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے لئے بیٹھا ہوا تھا۔

آفیسر نے اس کھڑکی کا معائنہ کیا جہاں سے بابر نے ایک سلاخ نکالی تھی۔ ڈاکٹر نثار نے کھڑکی کی چوکھٹ کے چھوٹے سے جلے ہوئے حصے کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ پہلے کا جلا ہوا ہے۔''

آفیسر نے سگریٹ کے ایک ٹکڑے کو فرش پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر آپ کون سا برانڈ پیتے ہیں؟''

ڈاکٹر نے گڑبڑا کر کہا۔ ''میں سگریٹ نہیں پیتا لیکن ہمارے ہاں کام کرنے والے پتا نہیں کون کون سا برانڈ پیتے ہیں۔ شاید کسی نے یہاں سگریٹ کا ٹوٹا پھینک دیا ہے۔''

بابر نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آفیسر، یہ میں نے سگریٹ پیا تھا اور یہ دیکھئے وہی برانڈ میرے پاس ہے۔''

آفیسر نے ڈاکٹر کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر، مجھے بہت پہلے سے تم لوگوں پر شبہ رہا ہے لیکن کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ آج بھی میرے یہاں پہنچنے سے پہلے تم نے بازی پلٹ دی۔ میں صرف سگریٹ کے اس برانڈ کو لے کر اور کھڑکی سے نکلی ہوئی ایک سلاخ کے ذریعے تم لوگوں کو مجرم ثابت نہیں کر سکتا۔''

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''آفیسر آپ کھسیانی باتیں کر رہے ہیں۔ میری توہین بھی کر رہے ہیں۔ جب میں مجرم ثابت ہو جاؤں گا تو آپ اس قسم کی گفتگو کریں۔''

آفیسر نے کہا۔ ''مسٹر بابر، آپ میرے ساتھ آئیں۔ آپ کی تنہا چشم دید گواہی کام نہیں آئے گی لیکن آج کے بعد میں ان لوگوں کو یہاں سکون سے رہنے نہیں دوں گا۔ کیا ہوا کہ جرم ثابت نہ ہو سکا لیکن انہیں جرم کرنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔ آئے دن اچانک ہی چھاپے مارا کروں گا اور یہ پریشان ہو کر یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

بابر، پولیس ٹیم کے ساتھ شہر واپس آ گیا۔ وہاں اس نے آفیسر کے سامنے تحریری بیان دیا۔ جو کچھ اس نے آنکھوں سے دیکھا تھا اور جس طرح پولیس ٹیم نے وہاں جا کر تفتیش کی تھی وہ سب کچھ اس نے لکھا اور اپنے دستخط کر دیئے۔

آفیسر نے کہا۔ ''بعض حالات میں قانون مجبور ہو جاتا ہے، مجرم سامنے ہوتا ہے لیکن اسے گرفت میں نہیں لیا جا سکتا۔ جب ایسا نہیں ہوتا ہے تو کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی اس ڈاکٹر کو دھمکی دی ہے اور میں اس دھمکی پر عمل کروں گا۔ ان سب باتوں کے علاوہ ایک حقیقت یہ ہے کہ ہم عورت کے بغیر زندہ تو رہ سکتے ہیں۔ مگر مہذب انسان بن کر نہیں رہ سکتے۔''

بابر جب اپنے گیراج میں واپس آیا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا۔ بتی جلائی۔ کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ صرف درخشاں کا جلوہ تھا۔

وہ کبھی اس کی نگاہوں کے سامنے آ کر مسکراتی تھی۔ کبھی روتی تھی، دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھتی تھی۔ وہ مسکراتی تھی تو بابر کے لئے، روتی تھی تو بھائی کے لئے۔ بابر بے چینی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایسی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ راحت جان کو راحت بیگ بنا کر درخشاں کے پاس لے جاتا۔ فی الحال راحت بیگ سے اس کا ملنا بہت ضروری

تھا اور راحت بیگ کو یہ سمجھانا تھا کہ اب وہ دن کی روشنی میں بابر سے ملاقات نہ کرے۔ بہروز یا اس کے آدمیوں نے اسے اور بابر کو ایک ساتھ دیکھ لیا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ بابر، راحت جان کیلئے ہی انہیں نقصان پہنچا رہا تھا۔

پھر بابر کو لیلیٰ کا کتا یاد آیا۔ اس کتے کے ذریعے وہ درخشاں سے خط و کتابت کر سکتا تھا۔ اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کی تحریر پڑھ کر اس کے دل میں جھانک سکتا تھا۔ وہ اس کتے کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ لیلیٰ کے کتے کو مجنوں کے پاس ہی ہونا چاہئے لیکن راحت جان یہ کہہ کر کتے کو اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ یہ اس کی بہن کی نشانی ہے۔ جب بابر کو ضرورت ہوا کرے گی تو وہ کتے کو لے جایا کرے گا۔

وہ سو نہ سکا۔ سوچتا رہا اور جاگتا رہا۔ چار بجے پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جوتے پہنے۔ پچھلے دروازے کو باہر سے بند کیا۔ دوسری طرف سے گھوم کر گیراج میں آیا۔ وہاں سے ایک گاڑی نکالی پھر اس میں بیٹھ کر راحت جان کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ راحت جان سے منہ اندھیرے ملاقات کرنا مناسب تھا۔ اس وقت کوئی دشمن اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔

☆======☆======☆

اس نے اقبال مارکیٹ کے پاس گاڑی روک کر ہلکا سا ناشتہ کیا۔ چائے پی۔ پھر وہاں سے چل پڑا۔ جب وہ راحت جان کی کوٹھی کے قریب پہنچا تو اس وقت پانچ بج کر پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ صبح ہو رہی تھی۔ کوٹھی کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ وہاں کچھ پولیس والے نظر آ رہے تھے۔ وہ گاڑی سے اتر کر مین گیٹ پر آیا۔ ایک سپاہی نے پوچھا۔ ''آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''راحت جان سے۔ وہ میرے دوستوں میں سے ہے۔''

ایک سپاہی اسے اپنے ساتھ کوٹھی کے احاطے میں لے گیا۔ کوٹھی کے برآمدے میں دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ اسی وقت ایک انسپکٹر کوٹھی کے اندر آیا۔ سپاہی نے کہا۔ ''جناب، یہ راحت جان سے ملنے آئے ہیں۔ اپنے آپ کو اس کا دوست بتاتے ہیں۔''

انسپکٹر نے قریب آ کر بابر کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تم راحت جان کو کب سے جانتے ہو؟''

''بچپن سے، ہم دسویں جماعت تک ایک ساتھ پڑھتے رہے۔ پھر حالات نے ہمیں جدا کر دیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد پرسوں اس سے ملاقات ہوئی تھی لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔ یہاں آپ لوگوں کی موجودگی مجھے کچھ الجھا رہی ہے۔ آپ مجھے بتائیں۔ راحت جان خیریت سے تو ہے؟''

انسپکٹر نے کہا۔ ''ہمیں افسوس ہے۔ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔'' یہ سنتے ہی بابر ایکدم لڑکھڑا گیا۔ اس کے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ راحت جان یوں اچانک ہی دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ انسپکٹر اسے غور سے دیکھ رہا تھا جیسے سمجھنا چاہتا ہو کہ قاتل کہیں بابر تو نہیں ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''تم کہاں رہتے ہو؟''

بابر نے جواب دیا۔ ''قاسم روڈ پر میں بابر گیراج کا مالک ہوں اور وہیں ایک

کمرے میں رہتا ہوں۔''

''کل رات تقریباً دس بجے سے بارہ بجے تک تم کہاں تھے؟''

''میں اسپیشل پولیس کے آفیسر ارشاد حسین کے ساتھ ایک پولیس ریڈ میں شامل تھا۔''

انسپکٹر نے پھر اسے سر سے پاؤں تک بے یقینی سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ کوٹھی کے اندر جانے لگا۔ بابر اس کے پیچھے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ یہاں وہ راحت جان کے ساتھ پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس ڈرائنگ روم اور ان صوفوں کو دیکھ کر راحت جان بے طرح یاد آ رہا تھا اور اس کی یاد دل میں نشتر چبھو رہی تھی۔

انسپکٹر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے کے بعد اس پولیس آفیسر ارشاد حسین سے رابطہ قائم کر چکا تھا اور اس سے بابر کے متعلق معلومات حاصل کر رہا تھا۔ پھر اس نے فون پر کہا۔ ''یہاں ایک خسر اراحت جان قتل ہو چکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دس اور بارہ بجے یہ قتل ہوا ہے۔ ہمیں ایک بجے اس کی اطلاع ملی ہے۔ بہر حال اتنی صبح میں نے آپ کو زحمت دی۔ شکریہ۔''

اس نے ریسیور رکھ کر کہا۔ ''تم اپنے دوست کو دیکھنا چاہو تو میرے ساتھ آؤ۔''

وہ انسپکٹر کے ساتھ راحت جان کی خوابگاہ میں پہنچا۔ اس کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ بابر کو دکھانے کے لئے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی گئی۔ بابر نے اسے دیکھا تو دیکھ نہ سکا۔ راحت جان کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ ایک دم سے درخشاں یاد آ گئی۔ اس نے فوراً ہی منہ پھیر لیا۔

انسپکٹر نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ کیا تم کسی پر شبہ ظاہر کر سکتے ہو کہ تمہارے دوست کا قاتل کون ہوگا؟''

بابر نے کہا۔ ''پرسوں جب میں یہاں آیا تو میری حیثیت راحت جان کے سیکرٹری کی تھی۔ میں نے اس کا ایک فون اٹینڈ کیا تھا۔ کوئی مرزا صاحب تھے۔ پورا نام میں بھول رہا ہوں۔ وہ مرزا خان دلاور خان کا رقیب ہے۔ راحت جان سے کہہ رہا تھا کہ وہ دلاور خان کو چھوڑ دے اور اس کے پاس چلا آئے۔ وہ دلاور خان سے زیادہ اسے رقم دے گا لیکن راحت جان نے صاف طور سے انکار کر دیا تھا۔ تب مرزا نے دھمکی دی کہ اگر اس کی

پیش کش قبول نہ کی گئی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ انسپکٹر نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ مقتول تمہارا بچپن کا ساتھی ہے اور کلاس فیلو رہ چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ برس پہلے وہ خسرا نہیں تھا۔"

"جی ہاں، وہ ایک بہت ہی ذہین طالب علم تھا۔ بہت ہی شریف لڑکا تھا اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا تھا۔ اپنی بیمار ماں کو ایک نئی زندگی دینے، اپنی بہن کا مستقبل سنوارنے، انہیں فاقوں سے بچانے کے لئے اس راہ پر نکل گیا تھا۔"

انسپکٹر نے تشویش کا اظہار کیا۔ "ان پانچ برسوں میں خسروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کہاں سے چلے آتے ہیں۔ کل رات تم جس آفیسر ارشاد حسین کے ساتھ تھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ چکوالی تھانے سے آگے جس ویرانے میں وہ چرچ نما چھوٹا سا قلعہ ہے وہی جرائم کا اڈا ہے اور وہیں سے خسروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کل انہیں کوئی ثبوت نہ مل سکا، مگر اب وہ لوگ نظروں میں آ گئے ہیں۔"

بابر نے پوچھا۔ "کیا اس واردات کی اطلاع، راحت کی ماں اور بہن کو دی جائے گی۔"

"کیا تم ان کا پتہ جانتے ہو؟"

اس سے پہلے کہ بابر کوئی جواب دیتا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے سے آواز آئی۔

"میں جانتا ہوں۔"

انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک قد آور، لحیم شحیم شخص کھڑا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے اندر آیا۔ پھر انسپکٹر کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے خان دلاور خان کہتے ہیں۔ فون پر آپ کا حکم سنتے ہی حاضر ہو گیا ہوں۔"

انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے مصافحہ کیا۔ پھر پوچھا۔ "کیا آپ مسٹر بابر کو جانتے ہیں۔ یہ راحت جان کا بچپن کا ساتھی ہے؟"

خان دلاور خان نے بابر کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ "مسٹر بابر، آپ

برا نہ مانیں۔ راحت نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اپنے پیچھے بہت بڑی جائیداد چھوڑ گیا ہے۔ جب کوئی دولت مند مرتا ہے یا قتل ہوتا ہے تو اس کے سینکڑوں رشتہ دار اور دوست، احباب پیدا ہو جاتے ہیں۔"

بابر نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انسپکٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نہیں مسٹر بابر یہ آپ لوگوں کی بحث کا موقع نہیں ہے۔ مسٹر دلاور خان آپ میرے سوالات کا جواب دیں۔ آپ پچھلی رات دس سے بارہ بجے کے درمیان کہاں تھے؟"

"میں شام چھ بجے سے ابھی صبح آپ کا فون وصول کرنے تک اپنے بنگلے میں تھا اور آرام سے سو رہا تھا۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا شام چھ بجے سے سو رہے تھے؟"

"نہیں، میں اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق کھانے کے بعد کچھ دیر تک اپنے کاروباری کھاتوں کی جانچ پڑتال کرتا رہا۔ پھر گیارہ بجے سو گیا۔"

"کیا آپ اس قتل کے سلسلے میں کسی پر شبہ کرتے ہیں؟"

خان دلاور خان نے پھر بابر کو دیکھا۔ اس کے بعد اس سے نظریں ہٹاتے ہوئے بولا۔ "راحت جان کے چاہنے والے بے شمار تھے بے شمار اس کے طلب گار ایسے ہیں جو اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ آپ جانتے ہیں، جو چیز حاصل نہیں ہوتی اسے لوگ چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ چھیننے کے لئے بھی حوصلہ چاہئے یا دولت چاہئے، تمام دولتمندوں میں جس نے کھل کر راحت جان کے سلسلے میں میری مخالفت کی ہے۔ وہ ہے مرزا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "گویا راحت جان ایک ایسا نایاب ہیرا تھا جو صرف آپ کے پاس تھا اور دوسرے تمام لوگ اس کے لئے للچاتے تھے۔ بھلا یہ ہیرا کیسا تھا۔ کیا خاصیت تھی اس میں آپ نے کیوں اسے اپنے پاس رکھا تھا؟"

دلاور خان نے کہا۔ "آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں اسے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ وہ بھی میری بہت عزت کرتا تھا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "بہت خوب، آپ نے ایک دوست کو اتنی شاندار کوٹھی خرید کر دی۔ یہاں آرام و آسائش کے تمام سامان مہیا کئے۔ ایک ائیر کنڈیشنڈ کار خرید کر دی۔ اگر

راحت جان کا بینک اکاؤنٹ چیک کیا جائے تو وہاں بھی اچھی خاصی رقم کا حساب ملے گا۔ میں نے آج تک اپنی زندگی میں نہ تو دیکھا ہے نہ سنا ہے کہ کسی نے صرف دوستی کی خاطر کوٹھی کسی کے نام لکھ دی ہو اور اتنا سب کچھ دوست کے لئے کیا ہو۔''

اس نے ڈھٹائی سے کہا۔''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ کی مرضی ہے۔ آپ میرے خلوص پر شبہ کر سکتے ہیں۔''

انسپکٹر نے ناگواری سے کہا۔''آج تک اتنے گناہ پردے کی آڑ میں نہیں کئے گئے، جتنے خلوص کی آڑ میں کئے گئے ہیں۔ بہرحال میں گناہوں کے سلسلے میں آپ کا محاسبہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ کے خلاف میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ فی الحال آپ ایک زحمت کریں۔ ریسیور اٹھا کر مرزا کا نمبر ڈائل کریں۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

خان دلاور خان نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کئے۔ پھر دوسری طرف سے کچھ سننے لگا۔ اس کے بعد اس نے ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''جناب وہاں بھی معاملہ کچھ گھمبیر ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر نے فون ریسیو کیا ہے۔ آپ بات کریں۔''

انسپکٹر اس سے ریسیور لے کر باتیں کرنے لگا اور دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ اس کے بعد اس نے ایک لمبی گفتگو کے بعد ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔''مرزا نے خودکشی کر لی ہے۔''

بابر نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بے یقینی سے پوچھا۔''کیا مرزا نے خود اپنی جان دے دی؟''

''ہاں، اُدھر ایک انسپکٹر موجود ہیں جو مرزا کی موت کے سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں۔ اس کی خواب گاہ کی میز پر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اس میں مرزا کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ راحت جان کو قتل کرنے کے بعد اب وہ زندہ نہیں رہے گا۔ راحت جان کے بغیر اس کی دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خود کو موت کے حوالے کر رہا ہے۔''

انسپکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔''اس احمق نے اپنی خواب گاہ کی چھت سے ایک رسی باندھ کر اپنے گلے میں ایک پھندا ڈال کر موت کو گلے لگا لیا۔ کتنے افسوس کی اور

کتنی شرم کی بات ہے۔ پہلے ہم ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور محبوباؤں کے لئے جان دیتے تھے اور آج؟'' انسپکٹر نے خان دلاور خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔''میں اردو زبان جانتا ہوں مگر محاوروں اور کہاوتوں کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں۔ شاید ازدواجی زندگی میں عورت کو مرد کا اور مرد کو عورت کا نصف بہتر کہا جاتا ہے۔ راحت جان کو آپ کا نصف کمتر کہنا چاہئے۔''

خان دلاور خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آرام سے چلتا ہوا ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے کہا۔''راحت جان کے قاتل کا پتہ چل گیا۔ قتل کرنے والا خود اعتراف کرنے کے بعد اپنی جان دے چکا ہے۔ اب آپ فرمایئے راحت جان کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں کیا ہو گا۔ وہ کس حیثیت سے؟ یا آپ کے نصف کمتر کی حیثیت سے.........؟''

خان دلاور خان نے کہا۔''انسپکٹر آپ نے بہت طنز کر لیا۔ اب مجھے، حقیقت کیا ہے، یہ بتانا ہی ہو گا۔ تو سنئے، میں راحت جان پر جو مہربانیاں کرتا آیا ہوں، جو دولت میں نے لٹائی ہے۔ وہ راحت جان کے لئے نہیں بلکہ اس کی بہن سے شادی کرنے کے لئے لٹائی ہے۔''

یہ سنتے ہی بابر چکرا کر رہ گیا۔ ایک دم سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خان دلاور خان کو دیکھنے لگا۔

دلاور خان نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔''درخشاں کی ماں اس رشتے کے لئے راضی ہے۔ راحت جان بھی راضی تھا۔ ہماری منگنی کی رسم ادا ہونے والی تھی لیکن مرزا کی حماقت سے اب یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ بہرحال میں دو چار مہینے انتظار کر لوں گا۔ پھر راحت جیسے دوست کی ماں اور بہن کو بے آسرا نہیں ہونے دوں گا۔ درخشاں کو اپنی شریک حیات بنا کر لاؤں گا اور.........''

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ بابر نے اپنی جگہ سے اچھل کر کہا۔''تم جھوٹ بولتے ہو۔ درخشاں سے تمہاری منگنی نہیں ہو سکتی۔ راحت جان اپنی بہن کو مجھ سے منسوب کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ دلاور خان غلط بیانی سے کام نہ لو۔''

خان دلاور خان نے بڑے تحمل سے کہا۔''میں تمہارے الزام پر غصے کا اظہار نہیں

کروں گا۔ درخشاں کی اور راحت جان کی والدہ کے وہ خطوط میرے پاس ہیں جو وہ اپنے
بیٹے راحت بیگ کے نام تحریر کرتی رہی ہیں۔ ادھر سے جب میں امریکی بینک کے ذریعے
اس کی والدہ کو رقم بھیجتا تھا تو اس میں راحت جان کا خط بھی ہوتا تھا۔ اس کی ماں اور اس کی
بہن درخشاں، جو خطوط جواباً بھیجتی تھیں۔ وہ بھی سب میرے پاس موجود ہیں ان سے
ثابت ہو جائے گا کہ مجھ سے درخشاں کا رشتہ کرنے کے لئے ماں اور بیٹا دونوں ہی
تیار تھے۔''

بابر نے پوچھا۔''جب وہ خطوط، ماں اور بہن کی طرف سے راحت جان کے پاس
آتے تھے تو وہ سارے خطوط تم نے کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ وہ تو راحت جان کے پاس
اس کوٹھی میں ہونا چاہئیں۔''

''یہ میرا، راحت جان کا اور اس کے گھر والوں کا معاملہ ہے تم پوچھنے والے کون
ہوتے ہو؟''

انسپکٹر سوچتی ہوئی نظروں سے خان دلاور خان کو دیکھ رہا تھا اس نے سوال کیا۔
''مسٹر دلاور، یہ بتائیں، آپ درخشاں سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ بہت
خوبصورت ہے؟ اس میں کیا خوبی ہے؟ اگر خوبصورت ہے اور اگر اس میں خوبیاں ہیں تو
کیا آپ نے اسے دیکھا ہے اور اگر دیکھا ہے تو کہاں دیکھا ہے؟''

دلاور خان نے کہا۔''میں کسی نامحرم کو کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے کبھی کبھی راحت
جان کی زبان سے اس کی تعریف سنی۔ پھر اس کے جو خطوط آتے تھے۔ اس کی تحریر سے اس
کے حسن کا پتا چلتا تھا۔''

''کیا آپ تحریر شناس ہیں؟''

''جی ہاں، اب سے تقریباً پندرہ برس پہلے میں اسی سلسلے میں سرکاری ملازم تھا۔
بہت اچھے عہدے پر فائز تھا۔ تحریروں کی شناخت کرتا تھا۔ مجرموں کی نشاندہی کرتا تھا۔ ان
کی نقالی کو فوراً پکڑ لیتا تھا۔ پھر یہ کہ تحریروں کے ذریعے میں بتاتا تھا کہ ان کا حلیہ کیا ہوسکتا
ہے۔ وہ کس حد تک بدصورت یا کس حد تک خوبصورت ہوں گے۔ ان کا مزاج کیا ہوگا۔
ان کے عادات واطوار کیا ہوں گے۔''

''اتنی مہارت حاصل کرنے کے بعد آپ کاروباری لائن میں کیوں آگئے۔''

''یہ تو کھلی حقیقت ہے کہ کاروبار میں دولت ہی دولت ہے۔ بشرطیکہ تقدیر ساتھ
دے۔ اس شہر کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی فہرست میں میرا نام بھی آتا ہے۔''

انسپکٹر نے کہا۔''جس پتے پر ان ماں بیٹی سے خط وکتابت ہوتی تھی اور رقم بھیجی جاتی
تھی۔ وہ پتہ مجھے دے دیجئے۔ میں اس سانحہ کی اطلاع انہیں پہنچا دوں گا۔''

بابر نے کہا۔''انسپکٹر صاحب، میری ایک التجا ہے۔ ان ماں بیٹی سے یہ بات چھپائی
جائے کہ راحت بیگ، راحت جان بن گیا تھا۔ انہیں بہت دکھ ہوگا۔''

انسپکٹر نے دلاور خان کی طرف دیکھا۔

خان نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔''بے شک وہ ماں بیٹی مقتول کی توہین برداشت نہیں
کرسکیں گی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ ان سے حقیقت چھپائی جائے۔''

یہ کہہ کر وہ ایک کاغذ پر ان کا پتہ لکھنے لگا۔ بابر انسپکٹر سے رخصت ہو کر کوٹھی سے باہر
آیا۔ پورچ میں پہنچتے ہی وہ کتا جانے کہاں سے دوڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور اس کے
قدموں سے سر رگڑنے لگا۔ بابر نے اسے اٹھالیا۔ احاطے کے گیٹ پر دو سپاہی تھے۔ انہوں
نے کتے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ اسے لے کر اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے
اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل پڑا۔''

شام کو اس نے پولیس آفیسر ارشاد حسین سے ملاقات کی۔ ان سے درخواست کی۔

''جناب، میں اپنے دوست راحت بیگ کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لئے
سرحدی بستی میں جانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اپنے ذرائع استعمال کر کے مجھ پر یہ مہربانی کر
سکتے ہیں؟''

آفیسر نے کہا۔''سوری، مسٹر بابر! وہاں اتنی سخت پابندیاں ہیں کہ رشتہ داروں کے
علاوہ کوئی دوسرا کسی میت میں بھی شریک نہیں ہوسکتا۔''

''کیا وہ خان دلاور خان بھی وہاں نہیں جاسکے گا؟''

''جی ہاں، وہاں کوئی نہیں جاسکے گا۔ صرف ماں بیٹی کو اس کی لاش دکھائی جائے گی۔
انہیں ماتم کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلی جائیں گی۔ ان کے
جانے کے بعد سرکاری طور پر کچھ مرد اس میت کو اٹھائیں گے اور قبرستان لے جا کر دفن کر
دیں گے۔ ان کی قبر جہاں ہوگی۔ وہ جگہ ان ماں بیٹی کو بتا دی جائے گی۔ تاکہ وہ کبھی قبر

پر پھول چڑھانے یا فاتحہ پڑھنے کے لئے وہاں جاسکیں۔''

وہ مایوس ہو کر واپس اپنے گیراج میں آ گیا اور کوئی تدبیر سوچنے لگا۔ ایک کتا ہی ایسا رہ گیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ اپنے دل کی بات درخشاں تک پہنچا سکتا تھا اور دلاور خان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرسکتا تھا کہ وہ کس حد تک سچ بول رہا تھا۔

اس نے ایک دن صبر کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی درخشاں بھائی کی موت پر رو رہی ہو گی۔ دوسرے دن بھی اس نے انتظار کیا تاکہ بہن کے آنسو کچھ تھم جائیں۔ تیسرے دن اس نے ایک کاغذ پر اپنے دل کی دھڑکنوں کو پیش کیا۔ راحت بیگ کی موت پر افسوس کا بھرپور اظہار کیا اور اس کے ساتھ تمام عمر محبت اور وفاداری سے نبھانے کے وعدے کئے۔ اس خط میں بہت کچھ لکھا۔ پھر اسے تہہ کر کے ایک پٹے میں چھپا دیا۔ اس پٹے کو کتے کی گردن سے باندھ دیا۔ پھر اسے لے کر ایک گاڑی میں بیٹھ کر شہرِ جاناں کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

ایک ہائی وے پر سفر کرتے رہنے سے سرحدی بستی کی مشرقی سرحد آتی تھی۔ وہاں سخت پہرہ تھا۔ ہائی وے پر سے گزرنے والوں کو وہاں رکنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب وہ فاصلہ طے ہو جاتا تو پھر اسی راستے پر زنانہ شہر کی مشرقی سرحد آتی تھی۔ وہاں بھی ویسا ہی سخت پہرہ لگا رہتا تھا۔ بابر جب اس سرحد کی پہلی چوکی پر پہنچا تو وہاں اس سے کہا گیا کہ اب یہاں سے پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے جاؤ۔ جہاں زنانہ شہر کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ وہاں دوسری چوکی پر تم ٹھیک پچیس منٹ کے بعد پہنچ جاؤ گے۔ مسافروں کو دو منٹ اور چھوٹ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اٹھائیسویں منٹ پر ان کا محاسبہ ہوتا ہے۔ اگر تم بھی اٹھائیسویں منٹ پر وہاں پہنچو گے تو تمہیں وضاحت کرنا پڑے گی کہ تین منٹ کی دیر کیوں ہوئی ہے۔ کس لئے تم راستے میں رک گئے تھے۔ اگر کار کی خرابی ہے تو اس چیک پوسٹ پر اپنی کار کو اچھی طرح چیک کرلو۔ ہم نے تمہارے اس کاغذ پر لکھ دیا ہے اور یہاں سے دوسری چوکی پر فون کے ذریعے یہ بتا دیں گے کہ ایک کتا تمہارا ہمسفر ہے لہٰذا دوسری چوکی تک اس کتے کو تمہاری گاڑی میں موجود رہنا چاہئے۔

اتنا سخت پہرہ اور ایسے انتظامات دیکھ کر بابر کو پسینہ آ گیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ اپنی درخشاں سے کیسے رابطہ قائم کرے۔ اس نے چیک پوسٹ کے آفیسر سے کہا۔

''جناب کتا ایک جانور ہے اور جانور کبھی قابو سے باہر ہوسکتا ہے۔ راستے میں یہ میری کار سے نکل کر بھاگ جائے تو میں کیا کرسکوں گا۔''

آفیسر نے غور سے بابر کو دیکھا۔ پھر کتے کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ایک سپاہی سے بولا۔ ''اس کے گلے کا پٹہ دیکھو''۔

بابر نے فوراً کہا۔ ''بس وہ گلے کا پٹہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔ آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟''

آفیسر نے مسکرا کر کہا۔ ''یہاں پہلے بھی کتنے ہی لوگوں نے کئی بار جانوروں کے ذریعے پیغام رسانی کی کوشش کی اور ہم نے ناکام بنادی۔''
اس وقت تک سپاہی نے تلاشی لے لی تھی اور وہ خط برآمد ہوگیا تھا۔ آفیسر نے اس خط کو پڑھا۔ بابر کا دل ڈوب رہا تھا۔ آفیسر نے پڑھنے کے بعد ایک گہری سانس لی۔ پھر اپنے ماتحت سے کہا۔ ''اس خط میں محبت کی گہرائی ہے۔ دل کی سچائی ہے، تڑپ ہے، بے چینی ہے۔ انسان کی ازلی بھوک پیاس ہے۔ یہ مسٹر بابر ہمارے راز دار رہ سکتے ہیں۔''
بابر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ہم بھی انسان ہیں۔ ہم بھی جانوروں کی طرح تنہا زندگی نہیں گزارنا چاہتے۔ ہم عورت کو اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ سمجھتے ہیں۔ ہم نے صرف ہوس کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس لئے عورت کو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتے رہے۔ سمجھتے رہے اور اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے رہے مگر اب محرومیوں نے ہمیں بہت کچھ سمجھا دیا ہے۔ میں تمہارے درد کو سمجھ رہا ہوں۔ تم اپنی درخشاں سے ضرور ملو گے۔''
بابر خوشی سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے دل میں اتنی مسرتیں بھر گئی تھیں کہ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔
آفیسر نے کہا۔ ''میرا ایک سپاہی تمہارے ساتھ جائے گا اور تمہیں زنانہ شہر تک پہنچا کر آجائے گا، اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں اگر تم مسلسل چلتے رہے تو دو گھنٹے کے اندر وہاں تک پہنچ جاؤ گے لیکن واپسی تک صبح ہو جائے گی۔ دن کو تمہارا واپس آنا خطرے سے خالی نہیں ہے ہم پر بھی الزام آسکتا ہے۔''
بابر نے پھر ذرا مایوس ہوکر پوچھا۔ ''میں پھر کیا کروں؟''
''تم واپس جاؤ اور کل شام کو آؤ تاکہ شام کو یہاں سے زنانہ شہر جاسکو تو صبح تک واپس آسکو یا پھر اس بات کی ضمانت دو کہ آج زنانہ شہر پہنچنے کے بعد پھر کل رات کو تم واپس آؤ گے اور تمہیں وہاں کسی گھر میں پناہ مل جائے گی۔''
بابر سوچنے لگا۔ کسی گھر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ درخشاں سے واقفیت تھی لیکن اس کی ماں اسے اپنے گھر میں پناہ دے گی یا نہیں یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا۔

آفیسر نے اسے سوچتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''دیکھو مسٹر۔ یہاں جتنے لوگ آتے ہیں اور جو ہمارے راز دار بن جاتے ہیں وہ کوئی ایسی حماقت نہیں کرتے کہ جس کی وجہ سے پھر ملاقات کا یہ راستہ بھی بند ہو جائے۔''
بابر نے کہا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے میری درخشاں کے گھر میں پناہ ملے گی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ صرف اس کتے کو اس خط کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔ مجھے جواب مل جائے گا۔''
آفیسر نے وہ خط اسے واپس کر دیا۔ اس نے خط میں پھر چند باتوں کا اضافہ کیا۔ اس نے لکھا۔ ''درخشاں، اگر میں کسی چور دروازے سے زنانہ شہر میں داخل ہو جاؤں تو کیا مجھے ایک آدھ دن کے لئے تمہارے گھر میں پناہ مل جائے گی۔ فوراً جواب لکھ کر بھیجو۔ میں ایک سرحدی علاقے میں تمہارے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔''
ایک سپاہی کتے کو اس خط کے ساتھ لے گیا۔ پھر اسے زنانہ شہر کے قریب چھوڑ کر آگیا۔ بابر وہیں چیک پوسٹ پر بیٹھا کتے کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ صبح چار بجے سے پہلے کچھ لوگ یکے بعد دیگرے اس چیک پوسٹ پر آنے لگے۔ وہ سب باری باری زنانہ شہر کی طرف سے آرہے تھے اور یہ تمام لوگ اس چیک پوسٹ کے پولیس آفیسر کے راز دار تھے اور چیک پوسٹ کا تمام عملہ ان سے تعاون کرتا تھا۔ سبھی انسان تھے اور سبھی اب عورت کی اہمیت کو سمجھنے لگے تھے۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ مردانہ شہر میں اب ایسی تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں اور ایسے لیڈر ابھر رہے ہیں جو زنانہ شہر پر اعتراض کر رہے ہیں اور مخلوط معاشرے کے لئے پھر حکومت سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔
جو لوگ زنانہ شہر سے واپس آرہے تھے۔ ان کے چہروں پر رونق تھی زندگی کی شادابی نظر آتی تھی۔ وہ محض محبوباؤں سے نہیں اپنی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں سے بھی ملنے جاتے تھے اور جو لوگ محبوباؤں سے ملنے جاتے تھے۔ وہ خود ہی اخلاقی ضابطے کی پابندی کرتے تھے۔ محبت کو ہوس نہیں بلکہ زندگی کی سب سے اہم ضرورت سمجھ کر جاتے تھے۔
بہرحال وہ زنانہ شہر سے آنے والے، آتے رہے اور مردانہ شہر کی طرف جاتے رہے۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک وہاں پھر پہلے کی طرح سناٹا چھا گیا۔ صرف بابر رہ گیا تھا۔ دن کے نو بجے وہ کتا واپس آیا۔ بابر نے فوراً ہی اس کے گلے کے پٹے کو کھول کر دیکھا تو اس میں

ایک دوسرا تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے اسے کھول کر پڑھا۔ درخشاں کی بہت خوبصورت تحریر تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''میں آپ کو کس انداز سے مخاطب کروں۔ کس رشتے سے پکاروں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس روز آنکھیں ملی تھیں جس روز پہلی بار آپ کو دیکھا تھا۔ اس سے پہلے شاید میں اندھی تھی۔ یا آنکھیں تھیں تو اس دنیا کے حسن کو نہیں دیکھا تھا۔ امی سچ کہتی ہیں کہ مرد کے بغیر عورت ادھوری ہوتی ہے۔ آج پتا نہیں آپ کا خط پڑھ کر کیوں میں خود کو ایک طرح سے مکمل محسوس کر رہی ہوں۔

بابر صاحب، آپ کو تو بھائی جان کے متعلق معلوم ہو چکا ہوگا۔ آنسوؤں کی برسات میں آپ کا خط یوں آیا جیسے بھری برسات میں ٹھنڈی مگر حرارت بخش دھوپ نکل آئی ہو۔ آپ نے بڑے اچھے موقع پر یہ خط لکھا اور مجھ سے رابطہ قائم کیا میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

سب سے پہلے تو آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے اس روز مجھے بھائی جان کی حقیقت نہیں بتائی۔ بھائی جان بھی مجھ سے چھپتے رہے۔ آپ نے بھی انہیں چھپایا۔ آہ! میں کتنی بدنصیب ہوں۔ میری امی بھی کیسی محرومیت کی زندگی گزارتی رہیں۔ بیٹے کو بالکل آنکھوں کے سامنے دیکھا اور اسے اپنے گلے سے نہ لگا سکیں۔ بھائی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے دعائیں نہیں دیں۔ منہ پھیر کر چلے گئے۔ وہ بھی چھپتے رہے۔ آپ نے بھی چھپایا۔ مزید حیرانی کی بات یہ کہ پولیس والوں نے ان کی لاش راحت بیگ کی حیثیت سے ہمارے پاس بھیجی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے۔ جب اتنی رازداری برتی گئی تو ہمیں حقیقت کیسے معلوم ہوگئی۔

تو سنیے! پچھلی رات یعنی اب سے تقریباً اٹھائیس گھنٹے پہلے خان دلاور، ہمارے ہاں آیا تھا۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ ایک مرد زنانہ شہر میں کیسے آ گیا۔ پہلے میں سنتی تھی کہ کچھ لوگ راتوں کو چھپ کر زنانہ شہر میں آتے ہیں اور اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کرتے ہیں۔ مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ خان دلاور آیا تو یقین آ گیا۔

اس نے بتایا کہ وہ زنانہ شہر کی شمالی سرحد سے پہرے داروں کو بہت بڑی رقم رشوت کے طور پر دے کر آیا ہے۔

اس نے آتے ہی امی سے اپنا تعارف کرایا۔ ثبوت کے طور پر ہمارے وہ خطوط پیش کیے جو ہم بھائی جان کو لکھتے رہے تھے۔ بھائی جان کے خط میں بار ہا خان دلاور کا تذکرہ رہا ہے۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ بھی پیش کیا۔ امی کو یقین ہو گیا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگیں۔ میں دوسرے کمرے میں تھی۔ میری عادت ہے کہ پڑھنے کے دوران میں کیسٹ ریکارڈر استعمال کرتی ہوں۔ ایک بار جو سبق یاد کرتی ہوں اسے ریکارڈ بھی کرتی جاتی ہوں۔ اسے سنتی ہوں کہ میں نے کہاں تک صحیح صحیح یاد کیا ہے۔ جب میں نے دوسرے کمرے سے یہ سنا کہ خان دلاور میرے رشتے کی بات کر رہا ہے تو میں اٹھ کر دروازے کے پاس آ گئی اور دروازے کی آڑ سے اس کی باتیں سننے لگی۔ امی کہہ رہی تھیں۔ ''میں چاہتی ہوں کہ یہ رشتہ ہو جائے لیکن میری بیٹی کو یہ منظور نہیں ہے۔''

خان دلاور خان اصرار کرنے لگا۔ ضد کرنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ امی کسی طرح راضی نہیں ہوتی ہیں تو اس نے کہا۔ ''میں درخشاں کی زبان سے انکار سننا چاہتا ہوں۔''

میں نے دروازے کے پیچھے سے کہا۔ ''میری امی جو کہہ رہی ہیں وہ درست ہے۔ آپ ہمارے بھائی جان کے مخلص دوست رہے ہیں ہم ہمیشہ آپ کی عزت کرتے رہیں گے۔''

خان دلاور نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مجھے خالی عزت کرانے کا شوق نہیں ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ضرور انکار ہوگا۔ بابر کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے مگر میں بھی ضد کا پکا ہوں۔ سن لو کہ تمہارا بھائی اور تمہارا بیٹا راحت بیگ نہیں رہا تھا وہ راحت جان بن گیا تھا۔''

اس کی بات سنتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ وہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا جب ہم نے بھائی جان کو محفل میں ناچتے گاتے دیکھا تھا۔ امی پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

خان دلاور خان نے کہا۔ ''میرے پاس یہ تمام کاغذات ہیں۔ یہ تمہارے بیٹے کو راحت جان ثابت کرتے ہیں۔ کہو تو میں ساری دنیا کے سامنے تمہارے بیٹے کی اصلیت ظاہر کر دوں۔''

اچانک ہی مجھے ہوش آیا۔ میں نے سوچا۔ اگر اس وقت ذہانت سے اور حوصلے سے کام نہ لیا تو بھائی جان کی اور تمام خاندان کی بدنامی ہوگی۔ پھر یہ کہ مجھے دلاور خان کے

آگے جھکنا پڑے گا۔

یہ سوچتے ہی میں نے کیسٹ ریکارڈر میں ایک نیا کیسٹ لگایا۔ پھر دروازے کے پاس آکر کہا۔ ''دلاور صاحب، آپ ذرا دروازے کے قریب آئیں۔ میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' ایسا کہنے سے پہلے میں نے ریکارڈر کو آن کر دیا تھا۔

دلاور نے قریب آکر کہا۔ ''فرمائیے؟''

''آپ ہمیں دھمکی دے رہے ہیں کہ بھائی جان کی اصلیت بے نقاب کر دیں گے؟''

''ہاں، میں ایک شریف آدمی کی طرح رشتہ مانگنے آیا ہوں مگر میری توہین کی جا رہی ہے تو پھر میں تمہارے بھائی کی توہین کیوں نہ کروں جب کہ وہ توہین کا مستحق ہے۔''

''کیا آپ نے مجھے حاصل کرنے کے لئے راحت بیگ کو راحت جان بنا دیا تھا؟''

''تم کچھ بھی سمجھ لو۔ بس وہ راحت جان کی حیثیت سے میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اسے رکھ لیا تھا۔ اس کی زندگی سنوار دی تھی۔ یہ جو تم ماں بیٹی عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہو تو یہ بھی میرا ہی دیا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر میں شادی سے انکار کر دوں تو؟''

''تو میں تمہارے بھائی کو بدنام کر دوں گا۔ تمہارا پورا خاندان بدنام ہوگا۔''

''اگر میں بدنامی کی پرواہ نہ کروں تو؟''

دلاور خان نے میری امی کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''ایک ماں کبھی یہ نہیں چاہے گی کہ اس کے بیٹے کی لاش دوبارہ قبر سے نکالی جائے اور وہ اس لئے نکالی جائے گی کہ شریف لوگوں کے قبرستان میں خسروں کو دفن کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔''

میری امی نے چیخ کر کہا۔ ''نہیں بیٹے نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ یہ بات کھلے گی تو میرے بیٹے کی مٹی برباد ہوگی۔ اس نے اپنے آپ کو ہمارے لئے قربان کر دیا۔ اپنی حیثیت بدل دی۔ خود کو انسانوں کی سطح سے گرا دیا مگر ہمیں سکھ چین دیتا رہا۔ بیٹی درخشاں تم بھی سوچو، سمجھو جو بھائی تمہارے آرام کے لئے جہنمی زندگی گزار رہا تھا کیا اب اسے قبر میں آرام سے سونے بھی نہیں دو گی۔ کیا اسے پھر وہاں سے نکالا جائے گا۔ نہیں، اس سے پہلے میں مر جاؤں گی۔''

دلاور خان نے کہا۔ ''مریں آپ کے دشمن۔ آپ صرف اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ جس دن یہ میری شریکِ حیات بن کر میرے پاس آئے گی میں یہ تمام ثبوت جلا کر راکھ کر دوں گا۔''

میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''امی، مجھے یہ رشتہ منظور ہے مگر میری ایک شرط ہے۔''

دلاور خان نے جلدی سے کہا۔ ''میں ہر شرط منظور کرتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میری شرط یہ ہے کہ جو مجھ سے شادی کرنا چاہے وہ میرے بھائی کے قاتل سے انتقام لے اور اسے قتل کرے۔''

دلاور خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ تمہارے بھائی کا قاتل خودکشی کر چکا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہمیں سرکاری طور پر بھی یہی اطلاع دی گئی تھی مگر میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں کسی طرح بابر سے رابطہ قائم کروں گی۔ وہ ضرور میرے بھائی کے قاتل کے بارے میں معلومات فراہم کرے گا۔''

بابر صاحب، میں ماہر نفسیات نہیں ہوں مگر اتنا جانتی ہوں کہ عورتوں کی طرح مرد بھی ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔ حسد کرتے ہیں اور ان میں رقابت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ میری اس بات نے کام کیا اور دلاور آپ کے ذکر پر فوراً ہی بولا۔ ''وہ کیا معلومات فراہم کرے گا۔ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ میرے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ میرے بھائی جان کے قاتل کی لاش کو قبر سے نکال کر دوبارہ اسے قتل کرے تو وہ ایسا بھی کر گزرے گا۔''

دلاور خان نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ جو میرا جیون ساتھی بنے وہ پہلے میرے بھائی کے قاتل سے انتقام لے۔''

اس نے بے اختیار کہا۔ ''میں انتقام لے چکا ہوں۔ میں نے اسے خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ مرزا کی کوٹھی پر گیا تھا وہ اپنی خوابگاہ میں تھا۔ میرے آدمیوں نے اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔ اس کے بعد ایک رسی کو چھت سے لٹکایا گیا اور اسی رسی سے مرزا کو لٹکا دیا گیا۔ اس کا کام تمام ہوگیا۔ اس کے بعد ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔ وہ اسی طرح رسی سے لٹکا رہا۔ میں نے ایک کاغذ پر اس کی طرف سے یہ خط لکھا کہ وہ راحت جان کو قتل کرنے کے بعد پچھتا رہا ہے۔ اس کے بغیر اس کی دنیا اندھیر ہوگئی ہے۔ وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اس لئے اپنی خوشی سے جان دے رہا ہے۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دلاور نے ایسا کیا ہوگا۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ دلاور خان میری طلب میں دیوانہ ہے تو اس دیوانگی میں اور میرے بھائی جان کے قاتل سے انتقام لینے کے جوش میں مرزا کو دوبارہ قبر سے نکالے اور اسے قتل کرے۔ اگرچہ یہ احمقانہ حرکت ہے لیکن عاشق، دیوانے اپنی محبوبہ کو خوش کرنے کے لئے ایسا بھی کر گزرتے ہیں۔ دلاور مجھے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرنے پر آمادہ ہوگا تو میں پولیس والوں کو اطلاع دوں گی تاکہ وہ عین اسی وقت اسے گرفتار کریں جب وہ قبر کھود کر مرزا کی لاش نکال رہا ہو لیکن یہاں تو بات کچھ اور ہی سامنے آئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "آپ نے مرزا کی طرف سے خودکشی کے سلسلے میں وہ خط کیسے لکھا۔ کیا پولیس والے یہ نہیں جان سکیں گے کہ اسے مرزا نے نہیں لکھا تھا؟"

دلاور نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ماہر تحریر ہوں۔ کسی کی بھی تحریر کی کامیابی سے نقالی کرلیتا ہوں اور کسی کی بھی تحریر پڑھ کر اس کے متعلق اچھی خاصی معلومات فراہم کردیتا ہوں۔ پولیس والے اسے مرزا کی تحریر سمجھیں گے۔ میں تم ماں بیٹی کو یہ راز اس لئے بتا رہا ہوں کہ یہاں کوئی تیسرا سننے والا نہیں ہے پھر یہ کہ تم میری شریک حیات بن جاؤ گی۔ میں تمہارے بھائی کی عزت برقرار رکھوں گا اور تم دونوں مجھ سے کبھی دشمنی نہیں کرسکو گی۔"

بابر نے اس خط کو پڑھتے پڑھتے الٹ دیا۔ کاغذ کے دوسری طرف درخشاں نے لکھا تھا۔ "بابر صاحب، یہ تمام باتیں میں ریکارڈ کر چکی ہوں۔ کیسٹ میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کیسٹ کی دوسری کاپی میں پولیس کے اعلیٰ افسران تک پہنچا دوں گی لیکن دلاور کی باتیں

سننے کے بعد میں سوچ رہی ہوں کہ میرے بھائی جان کتنے مظلوم اور مجبور تھے۔ وہ ہمیں بڑی بڑی رقمیں بھیجنے کے سلسلے میں دلاور خان کے محتاج تھے۔ آپ ایک بات بتائیں کیا بھائی جان نے آپ سے بھی یہ ذکر کیا تھا کہ وہ میرا رشتہ دلاور خان سے کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ آپ کے دوست تھے، آپ کو پسند کرتے تھے تو پھر وہ دلاور خان کو میرے لئے کیوں پسند کرتے تھے۔ ان کے خط میں ہمیشہ اس کی تعریفیں لکھی ہوتی تھیں جب کہ اس نے ہمارے سامنے آکر خود کو قابلِ نفرت ثابت کیا ہے۔ اگر بھائی جان آپ کو پسند کرتے تھے تو پھر اس خط کے لئے ہم کیا رائے قائم کریں جب کہ اس نے خود کو ماہر تحریر کہا ہے۔ جب وہ مرزا کے لئے ایک جعلی خط لکھ سکتا ہے تو کیا بھائی جان کی طرف سے ہمیں جعلی خط نہیں لکھ سکتا؟

بھائی جان کے نام سے جتنے خطوط اب تک ہمارے پاس آئے ہیں وہ سب ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ میں ان میں سے چند خط پولیس افسران کے پاس بھیجوں گی اور ان سے درخواست کروں گی کہ وہ تحریر کی شناخت کریں۔ امی کے پاس بھائی جان کے وہ خطوط بھی رکھے ہوئے ہیں اور وہ کاپیاں بھی موجود ہیں جب وہ سکول کے زمانے میں لکھا کرتے تھے۔ بھائی جان کی ان تحریروں سے باقی خطوط کا موازنہ ہو جائے گا۔

بابر صاحب، میں بالکل تنہا ہوں۔ امی اپنے کمرے میں سر چھپائے روتی رہتی ہیں۔ ہم نے دلاور صاحب سے وعدہ کیا ہے کہ وہ رشتے کا پیغام بھیجیں گے تو منظور کرلیا جائے گا مگر ان کے پیغام آنے اور ہمارے منظور کرنے سے پہلے ان کے خلاف کارروائی شروع ہو جائے گی۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ روز مجھے ایک خط لکھیں۔ میں تنہا ضرور ہوں لیکن جب بھی آپ کی یاد آتی ہے تو میری تنہائیاں آباد ہوجاتی ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں جانے کیسے آپ اور صرف آپ ہی اپنے لگتے ہیں۔ فقط

آپ کے خط کی منتظر۔ درخشاں"

خط کی تحریر ختم ہوگئی مگر بابر کی نظریں اس پر جمی رہیں۔ وہاں درخشاں کا ماہتابی چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جس کا پیار ملا ہے وہ کتنی ذہین اور حاضر دماغ ہے۔ اس نے بڑے موقع سے دلاور خان کی آوازیں ریکارڈ کی تھیں اور تحریر کے متعلق بھی بہت دور تک سوچ رہی تھی۔ وہ اب تک یقیناً دلاور خان کے خلاف کارروائی شروع کرچکی ہوگی۔

بابر وہ خط لے کر اس انسپکٹر کے پاس پہنچا جو راحت جان کے قتل کے سلسلے میں تفتیش پر مامور تھا۔

انسپکٹر نے خط پڑھنے کے بعد کہا۔ ''راحت جان کی بہن نے بہت ہی دانشمندانہ کام دکھایا ہے۔ مسٹر بابر، آپ یقین کریں۔ جب خان دلاور خان نے خود کو ماہر تحریر کہا تھا، اسی وقت سے میں شبے میں مبتلا تھا لیکن دلاور خان کے منہ پر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ کیسٹ حاصل ہو جائے تو دلاور خان کو قانون کے شکنجے میں کس لیا جائے گا۔ میں وہ کیسٹ درخشاں سے حاصل کروں گا۔ ابھی اس کے انتظامات کرتا ہوں۔''

بابر اپنے گیراج میں واپس آ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سفر کی تھکن تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی وہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے تھکن اور رت جگے کے باعث سو جانا چاہئے تھا لیکن درخشاں سونے نہیں دے رہی تھی، ہر لحہ نگاہوں کے سامنے آ کر جھنجھوڑ دیتی تھی اور اس کے سامنے مسکرانے لگتی تھی۔ کمرے میں اِدھر سے اُدھر چلتی رہتی تھی۔ اپنی چال دکھاتی تھی اپنی باتیں سناتی تھی پھر وہ اس کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سر کو سہلانے لگی تب وہ آہستہ آہستہ نیند کی گود میں چلا گیا۔

جب آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر غسل کیا۔ ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھایا۔ پھر باہر جانے کے لئے لباس پہننے لگا۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے لباس پہننے کے بعد دروازے کو کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ حیرانی سے آنے والی کو دیکھنے لگا۔ وہ کوئی جوان عورت تھی۔ مردانہ شہر میں اور کوئی عورت آئے۔ یہ بات حیرانی کی بھی تھی اور پریشانی کی بھی تھی۔ پریشانی اس لئے کہ وہ قانون کی گرفت میں آ سکتا تھا۔ اس سے سوالات کئے جا سکتے تھے کہ اس کے ہاں کوئی عورت کیسے آئی۔

اس کی حیرانی و پریشانی کے دوران ہی وہ عورت تیزی سے چلتے ہوئے کمرے کے اندر آ گئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں شمشاد کی بڑی بہن ہوں۔''

بابر نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن تم ہمارے شہر میں کیسے آ گئیں؟''

''یہ اب کوئی انوکھی بات نہیں رہی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ کتنے ہی مرد چوری چھپے پولیس والوں کو دوست بنا کر یا رشوت دے کر زنانہ شہر میں راتوں کو پہنچ جاتے ہیں۔ اسی

طرح عورتیں بھی یہاں آ جاتی ہیں۔''

''آتی ہوں گی یا مرد جاتے ہوں گے مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''کسی بہروز نامی شخص نے میرے پاس خبر بھیجی ہے کہ میرا بھائی اس کے قبضے میں ہے اگر میں نے یہاں آ کر آپ سے ملاقات نہ کی اور آپ کو ایک مخصوص مقام تک جانے پر مجبور نہ کیا تو وہ میرے بھائی کو قتل کر دے گا یا اس قابل بنا دے گا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔''

''اچھا تو بہروز اب کوئی نئی چال چل رہا ہے؟''

''میں نہیں جانتی کہ کیا چالبازیاں ہو رہی ہیں۔ میرا بھائی بہت معصوم ہے۔ آپ کے گیراج میں کام کرتا رہا ہے، اب وہ مصیبت میں ہے۔ وہ دشمنوں کے جال میں کیسے پھنس گیا۔ اس کے ذمہ دار آپ ہیں۔ آپ ہی اسے واپس لا سکتے ہیں۔''

''میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں نے شمشاد کو سمجھایا تھا لیکن وہ بہروز کے جال میں جا کر خود ہی پھنس گیا۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ ایک بھائی کی بہن کے سامنے اپنی مجبوری ظاہر کر رہے ہیں۔ آپ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو میں عورت ہو کر کیا کر سکتی ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا ہوا ہے کہ بھائی کی محبت میں یہاں تک چلی آئی۔ کیا آپ، ہم بہن بھائی کے لئے بہروز سے ملاقات نہیں کریں گے۔ خدا کے لئے اس سے کوئی سمجھوتہ کریں۔''

''بہروز نے کہاں ملاقات کرنے کے لئے کہا ہے؟''

''اس نے کہا ہے کہ میں آپ کو کسی گاڑی میں بٹھا کر شہر سے باہر لے جاؤں۔ وہ لوگ خود ہی آپ تک پہنچ جائیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے اپنے غنڈوں کے ذریعے گھیرنا چاہتا ہے۔ میں یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ میں پولیس والوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی پولیس والا یا کوئی تیسرا آدمی نظر آیا تو وہ میرے بھائی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''میں تمہارے احمق اور لالچی بھائی کی خاطر خود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔''

وہ دونوں بحث کرنے لگے۔ اسی دوران دروازے پر دستک سنائی دی۔ بابر نے

پریشان ہوکر دروازے کی طرف دیکھا۔ ''پھر پوچھا کون ....؟''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہم پولیس والے ہیں۔ دروازہ کھولو۔ مگر یاد رکھو۔ دوسری طرف سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ وہاں بھی ہمارے آدمی ہیں۔ یہاں جو عورت آئی ہے تم اسے چھپا نہیں سکو گے۔''

اس نے پریشان ہو کر شمشاد کی بہن کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف منہ پھیرے کھڑی تھی۔ دروازہ تو کھولنا ہی تھا۔ اب فرار کا یا بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا۔ پھر اس نے شمشاد کی بہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ہمارے شہر میں کیسے آئی اور پھر تمہارے گھر میں کیسے پہنچ گئی؟''

بابر نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اسے دیکھا ہے۔ یہ میرے ایک کاریگر شمشاد کی بہن ہے۔''

''جو کوئی بھی ہے۔ اب تھانے میں جا کر اپنا بیان دینا۔ ذرا حوالات کی سیر کرو۔ عدالت سے تم دونوں کو سنگسار کرنے کا فیصلہ ضرور سنایا جائے گا۔''

دو سپاہی آگے بڑھے۔ ایک نے اس کے بازو کو تھام لیا۔ دوسرے نے شمشاد کی بہن کو پکڑ لیا پھر انہیں دھکا دیتے ہوئے باہر لے گئے باہر کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ پولیس کی جیپ کار کھڑی ہوئی تھی۔ ایک سپاہی نے شمشاد کی بہن کو ڈرائیور کے پاس بٹھایا۔ خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بابر کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ اس کے پاس انسپکٹر اور سپاہی موجود تھے۔

پھر وہ جیپ کار آگے بڑھ گئی۔ بابر راستے میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ گنہگار نہیں ہے۔ جواب میں انسپکٹر ایک ہی بات کہہ رہا تھا کہ جو کہنا ہے عدالت میں کہنا۔

جیپ کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی جا رہی تھی۔ بابر کو بحث کرنے اور اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے دوران خیال ہی نہیں رہا تھا کہ تھانہ کتنی دور ہے اور گاڑی کب تک چلتی رہے گی۔ پھر اس نے چونک کر پوچھا۔ ''آخر وہ تھانہ کہاں ہے۔ آپ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

تب انسپکٹر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو دیکھا اور اس کا رخ بابر کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم پولیس والے نہیں ہیں تم بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتے ہو۔ اب تم اپنی خیر مناؤ۔''

بابر نے بے بسی سے ریوالور کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ ''مجھے جانے دو۔ ورنہ میں شور مچاؤں گا۔''

''یہ ریوالور تم سے اونچی آواز میں بولے گا۔ یقین نہ ہو تو چیخ کر دیکھ لو۔''

اس نے خاموش رہ کر سوچنا شروع کیا۔ شاید ان سے بچنے اور وہاں سے فرار ہونے کی کوئی تدبیر سمجھ میں آ جائے۔ اگلی سیٹ سے شمشاد کی بہن نے کہا۔ ''میں نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اب تو تم لوگ میرے بھائی کو چھوڑ دو گے؟''

جو شخص انسپکٹر کے روپ میں تھا اس نے کہا۔ ''یہ باتیں ماسٹر بہروز سے کرو۔ ہم تمہارے بھائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

بابر نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم کیسی بے وقوف عورت ہو دشمنوں کے جال میں آ کر تم نے مجھے بھی ان کے جال میں پھنسا دیا۔ تمہارے بھائی نے ایسی ہی حماقت کی تھی۔''

بہروز نے بڑی کامیاب چال چلی تھی۔ شمشاد کی بہن کو اس کے پاس بھیجا تھا اور اب وہ پولیس کی جیپ کار میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی۔ کتنے ہی لوگوں نے اس عورت کو دیکھا ہو گا اور مردانہ شہر میں یہ بڑی حیرانی کی بات ہو گی لیکن کسی نے اعتراض نہیں کیا ہو گا کیونکہ وہ پولیس والوں کے درمیان نظر آ رہی تھی اور وہ سب پولیس والے بہروپیے تھے۔

گاڑی شہر سے باہر آ گئی۔ باہر ایک پختہ سڑک پر دوڑتی رہی۔ بابر اپنی تقدیر کے بھروسے پر بیٹھا رہا۔ شاید کوئی موقع ملے تو فرار کی کوشش کرے۔ پھر تقدیر نے ایک جگہ موقع دیا۔ وہ جنگل کے درمیان ایک پختہ سڑک سے گزر رہے تھے۔ اچانک ہی ایک گیدڑ سڑک کو پار کرنے کیلئے ایک طرف سے دوسری طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ وہ گاڑی کے قریب آ گیا تھا۔ اس لئے اچانک ہی بریک لگانے پڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریوالور والا ایک جھٹکے سے سامنے کی طرف جھک گیا۔ بابر نے اسی وقت ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ تقدیر نے ایک ذرا سا موقع دیا تھا۔ وہ اس کی بدنصیبی تھی کہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ایک سپاہی نے کسی سخت چیز سے اس کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ پھر دوسری ضرب لگائی۔ حملہ ایسا شدید تھا کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اندھیرا تو پہلے ہی تھا اور اندھیرا

چھا گیا۔ پھر وہ ہوش سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

پھر پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ اسے ہوش آ رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے دوران درخشاں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے مسکرا رہی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔ میری محبت میں کہاں کہاں بھٹک رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ اتنی بڑی دنیا میں صرف تم ہی مجھے دل و جان سے چاہنے والے ہو۔ میری خاطر اپنی جان کی بازی لگاتے رہو گے اور ایک دن مجھے حاصل کر لو گے۔ میں تمہاری محبت پر ناز کرتی ہوں۔ وعدہ کرتی ہوں کہ میں بھی صرف تمہارے لئے زندہ رہوں گی۔ خان دلاور خان نے جبراً مجھے حاصل کرنے کی کوشش کی تو جان پر کھیل جاؤں گی۔

وہ اس کی میٹھی میٹھی محبت بھری باتیں سن رہا تھا اور اپنے اندر ایک نیا حوصلہ پا رہا تھا۔

پھر اس کے کانوں میں مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتیں آہستہ آہستہ لفظوں میں ڈھل کر واضح ہونے لگیں پھر وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے لگا۔

تب اس نے اپنے آپ کو کسی اجنبی جگہ پایا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ سوکھی گھاس کے بستر پر پڑا ہوا ہے اور ایک چمگادڑ اس کے سامنے چھت سے لٹک رہی ہے۔ چھت بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ پھر ایک چمگادڑ اس پر سے اڑتے ہوئے دوسری طرف گزر گئی۔ کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کسی نے کہا۔ ''ماسٹر، یہ ہوش میں آ رہا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر بابر نے سب سے پہلے بہروز کا چہرہ دیکھا۔ اس کی ناک پر آدھے فریم کی عینک تھی اور وہ عینک کے اوپر سے اسے گھور کر طنزیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے ڈاکٹر نثار دکھائی دیا۔ وہ بھی طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ آخر میں وہ خان دلاور خان کو دیکھ کر چونک گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سر کے زخم سے ایسی ٹیسیں اٹھیں کہ وہ کراہتے ہوئے پھر گھاس کے بستر پر گر پڑا۔

بہروز نے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ''ذلیل کمینے، تم نے میرے کاروبار کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ میرا وہ اڈا تو ختم ہی ہو گیا۔ پولیس والے اب وہاں

آتے جاتے رہیں گے۔ بہر حال یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ کہیں بھی نیا اڈا بنایا جا سکتا ہے لیکن میں تمہیں اب سکون سے رہنے نہیں دوں گا۔ تمہاری زندگی برباد کر دوں گا۔''

خان دلاور خان نے حقارت سے کہا۔ ''میں اپنے کسی رقیب کو معاف نہیں کرتا۔ بڑے بڑے دولت مند مجھ سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ تمہاری حیثیت کیا ہے۔ مرزا نے مجھ سے ٹکرانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ راحت جان کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیا۔ دوسری طرف مرزا کو پھانسی پر چڑھا دیا اور راحت جان کے قتل کا الزام بھی اس پر لگا دیا۔ دونوں کا ہی قصہ تمام ہو گیا۔''

بابر نے اپنے ایک ہاتھ کے بل اٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا واقعی تم نے میرے دوست راحت کو قتل کیا ہے؟''

''ہاں، وہ کمبخت اپنی بہن کو مجھ سے منسوب کرنے کے لئے کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ہر طرح سے کوشش کر لی۔ قتل کی رات اس نے دھمکی دی کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا اور درخشاں کی شادی تم سے کر دے گا۔ بس میں نے اسے یہ دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اب اس کا قصہ تمام ہو چکا ہے۔ میں آسانی سے درخشاں کو حاصل کر سکتا ہوں۔ تم ایک کانٹا ہو اور........'' یہ کہتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ڈاکٹر اس کانٹے کو نکال پھینکو۔''

ڈاکٹر شاید حکم کی تعمیل کرنا چاہتا تھا اس لئے وہاں سے چلا گیا۔

بہروز نے کہا۔ ''مسٹر دلاور! ہمارے سودے کی باقی رقم رہ گئی ہے۔ اس کانٹے کو نکال پھینکنے سے پہلے وہ ایک لاکھ روپے مجھے مل جانے چاہئیں۔''

خان دلاور خان نے کہا۔ ''میں نے پہلے کبھی تم سے بے ایمانی نہیں کی۔ راحت جان کے سلسلے میں بھی ہر ماہ دو ہزار روپے تمہیں ادا کرتا رہا۔ یہاں سے تم میرے ساتھ چلو گے تو اپنی کوٹھی پر پہنچ کر تمہیں ایک لاکھ روپے ادا کر دوں گا۔ مگر اس کمبخت کو ایسا سبق حاصل ہو جانا چاہئے کہ یہ کبھی درخشاں کی طرف رخ نہ کر سکے۔''

ان کی باتوں کے دوران ڈاکٹر واپس آ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی۔ وہ سرنج بلند کر کے اس کے اندر دوا کی مقدار کو سمجھ رہا تھا۔ پھر خان دلاور نے اچانک ہی بابر پر جھک کر اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ بابر پہلے ہی سر کے زخم

سے کمزور تھا۔ اس نے جدوجہد کی تو بہروز نے بھی آ کر اس کے بائیں ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر ڈاکٹر نے سرنج کی نوک بابر کے بازو میں پیوست کر دی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ بابر کو ہوش نہیں رہا۔ اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ پھر ایک بار بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

اخبارات چیخ رہے تھے۔ ہمیں مخلوط معاشرہ چاہئے۔ ہمیں اپنی وہی تہذیب چاہئے جس میں مرد عورت پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے بھی بھروسہ کرتا تھا اور عورت کسی ایک مرد سے بے وفائی کرنے کے باوجود اپنے باپ کے لئے ایک شریف بیٹی، بھائی کے لئے غیرت مند بہن اور اپنی آئندہ نسل کے لئے ایک ذمہ دار ماں ہوتی تھی۔ ہمیں وہی معاشرہ چاہئے۔

اب بڑی بڑی شاہراہوں پر بہت بڑی تعداد میں جلوس نکلتے تھے۔ میدانوں میں جلسے ہوتے تھے۔ ہر سیاسی جماعت کے لیڈر کا دعویٰ تھا کہ ہم اقتدار سنبھالتے ہی مخلوط معاشرہ قائم کر دیں گے۔ زنانہ شہر ختم ہو جائیں گے۔ سب مل جل کر انسانوں کی طرح زندگی گزاریں گے۔ جانوروں کی طرح الگ الگ کٹہرے میں نہیں رہیں گے۔

دانشمندوں نے کہا ہے کہ آنے والے وقت کو دیکھنا ہو تو نوشتۂ دیوار پڑھو۔ اب دیواروں پر جا بجا لکھا ہوتا تھا۔ ''عورت ہماری نصف بہتر ہے۔ ہماری بہتری اسی سے ہے۔''

کہیں لکھا ہوتا تھا۔ ''وہ نیند ہے ہمیں راتوں کو سلاتی ہے۔ وہ آرام ہے۔ ہماری تھکن اتارتی ہے۔ وہ اس دنیا کے پہلے انسان کی پہلی آرزو ہے اور آخری انسان کی بھی آخری آرزو رہے گی۔ اسے بلاؤ۔ اسے بلاؤ۔''

پہلے پہل دیواروں پر کوئلے کی لکیروں سے عورتوں کی تصویریں بنائی جانے لگیں۔ پھر بڑے بڑے سائن بورڈ اور ہورڈنگز میں عورتوں کی تصویریں بننے لگیں۔ اخباروں اور رسالوں میں بھی تصاویر شائع ہونے لگیں۔ دن مہینوں میں مہینے سال میں بدل گئے۔ جو تحریک شروع ہو چکی تھی وہ کامیاب ہونے لگی۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں عورتیں حصہ لینے لگیں۔ پھر ہسپتالوں اور سکولوں جیسے اداروں کو سنبھالنے کے لئے مردانہ شہروں میں آنے لگیں۔ جب آنے لگیں تو رہنے بھی لگیں۔ رفتہ رفتہ تبادلہ شروع ہو گیا کچھ لوگ زنانہ شہر میں گھر بسانے لگے اور کچھ عورتیں مردانہ شہروں میں آ کر آباد ہونے لگیں۔

ہر شہر کا حلیہ بدل گیا۔ اب وہاں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے۔ اب ہریالی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ ہر رنگ جدا جدا دکھائی دیتا تھا اور بڑا ہی خوبصورت لگتا تھا۔ ٹی وی، ریڈیو اور کیسٹ ریکارڈروں سے سات سُر بیدار ہوتے تھے۔ عورتوں کی رس بھری آوازیں سحر زدہ کر دیتی تھیں۔ اب وہ فٹ پاتھ پر سے گزرتی تھیں تو راہ چلنے والے ایک طرف ہٹ کر انہیں گزرنے کا راستہ دیتے تھے۔ بسوں میں عورتوں کو دیکھتے ہی مرد اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور انہیں بیٹھنے کی جگہ دیتے تھے۔ ایسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے وقت کوئی مرد کسی عورت سے کمتر نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے اخلاق اور تہذیب کی بدولت عورتوں سے برتر ہو جاتا تھا۔

اس نئے مخلوط معاشرے میں درخشاں بھی تھی۔ وہ صبح سے شام تک شاہراہوں پر، گلیوں میں، محلوں میں، بستیوں میں بابر کو تلاش کر رہی تھی۔ کہاں ہیں آپ۔ بابر صاحب آپ کہاں گم ہو گئے۔

اس نے ان پولیس افسران سے ملاقات کی جو بابر کو جانتے تھے اور بابر نے جن کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ ایک انسپکٹر نے کہا۔ ''میں تمہارے بھائی کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کر رہا تھا انہی دنوں بابر سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ تم نے جو خط بابر کو لکھ کر بھیجا تھا وہ میں نے پڑھا ہے۔ اسی کے ذریعے میں دلاور خان کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس کیسٹ کو بھی میں نے سنا اور ہمارے اعلیٰ افسران نے بھی سنا۔ پھر تحریر کے ماہرین سے اس سلسلے میں مدد لی گئی۔ ہم بڑی تن دہی سے خان دلاور خان کے اطراف قانون کے شکنجے مضبوط کر رہے تھے وہ گرفتار ہونے ہی والا تھا۔ اپنی سزا کو پہنچنے ہی والا تھا کہ اچانک اسے قتل کر دیا گیا۔''

درخشاں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کس نے قتل کیا؟''

''اس کی لاش کے پاس ایک پرچی ملی تھی۔ اس میں لکھا تھا۔ بیشک قانون اسے موت کی سزا دینے والا تھا لیکن قانونی کارروائی میں دیر ہوتی ہے اور اتنی دیر میں یہ بدبخت ایک بہن کے بھائی کو بدنام کر دیتا۔ اس بہن کو دنیا والوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیتا اس لئے میں اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر رہا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''ہم نے تصدیق کی ہے۔ خان دلاور خان کی لاش کے پاس پائی جانے والی پرچی بابر کے ہاتھ کی

تحریر تھی۔''

درخشاں نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔ ''آہ، انہوں نے مجھے بدنامی سے بچانے کے لئے دلاور خان کو قتل کر دیا۔ میری خاطر قاتل بن گئے مگر وہ کہاں ہیں۔ میں انہیں کہاں ڈھونڈوں؟''

انسپکٹر نے کہا۔ ''ہم بھی انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ بیشک انہوں نے قانون کا ساتھ دیا ہے مگر قانون کو ہاتھ میں بھی لیا ہے اور اس کے لئے انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا۔''

درخشاں نے پوچھا۔ ''ان کی سزا میں نرمی تو ہو سکتی ہے؟''

''ہاں، ہو سکتی تھی لیکن بابر نے دوسری بار پھر قانون کو ہاتھ میں لیا ہے اس نے بہروز کو قتل کر دیا۔''

درخشاں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ انسپکٹر نے کہا۔ ''شاید تم بہروز کو نہیں جانتیں۔ اسی کمبخت نے تمہارے بھائی کو خان دلاور کا نصف کمتر بنا دیا تھا۔''

درخشاں کی گردن جھک گئی۔ ندامت کی بات تھی اور بابر اس کو آگے بڑھنے اور پھیلنے سے روک چکا تھا۔

انسپکٹر نے کہا۔ ''ہم سمجھ گئے ہیں کہ اب بابر کا تیسرا شکار، ڈاکٹر نثار ہوگا۔ وہ اس ڈاکٹر کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے ہم نے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے اور اسے بھی یقیناً موت کی یا عمر قید کی سزا ملنا چاہئے۔''

وہ وہاں سے چلی آئی۔ بابر موٹر گیراج کو اس کے ایک کاریگر نے سنبھال لیا تھا۔

درخشاں کو اس نے بتایا۔ ''باجی، ہم تمام گیراج والے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ وہ زندہ سلامت ہیں۔ ایک دن واپس آئیں گے۔''

درخشاں نے ایک سرد آہ بھری۔ پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا جب وہ اپنے محبوب کا چہرہ دیکھے گی۔

☆======☆======☆

وہ درخشاں منزل کے سامنے ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر داڑھی اور مونچھیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ باقی

آدھا چہرہ سر کے لانبے بالوں نے چھپا لیا تھا۔ اس کے بدن پر مہینوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے انسانی تاریخ پر ہزاروں سال کی گرد جمی ہوئی ہے۔

وہ بس وہاں بیٹھا رہتا تھا اور سامنے درخشاں منزل کو دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی درخشاں گھر سے نکل کر جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور کبھی آتی ہوئی نظر آتی تھی۔ بس اس کا حسین جلوہ اسے زندہ رہنے پر مجبور کرتا تھا۔

ایک صبح وہ اپنی کار میں بیٹھ کر کوٹھی سے باہر آئی۔ اس کی کار ہمیشہ نگاہوں کے سامنے سے گزرتی تھی اور وہ اپنی جانِ حیات کی ایک جھلک دیکھ لیتا تھا۔ اس روز اس کے قریب پہنچتے ہی کار میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور باہر نکل کر بونٹ اٹھا کر اسے چیک کرنے لگا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی اس کی والدہ نے کہا۔ ''بیٹی، بہت ہو چکا۔ کیا ساری زندگی اسے تلاش کرتی رہو گی؟''

''ہاں، ساری زندگی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ ''وہ کمتر ہوتے ہیں جو کسی کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ میں ساتھ چھوڑنے والیوں میں سے نہیں ہوں۔ میں نے اپنے دل میں انہیں اپنا نصف بہتر مان لیا ہے اب اور کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

درخشاں کی یہ بات دل میں خنجر کی طرح اتر گئی۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہاں سے پلٹ کر دور چلا گیا۔ پھر سر گھما کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ گاڑی اب ٹھیک ہو گئی تھی اور آگے بڑھ رہی تھی۔ درخشاں دور جا رہی تھی۔ وہ بھی دور جانے لگا۔ تیزی سے چلنے لگا۔ کبھی دوڑنے لگا۔ اس سے دور بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ گر پڑا۔ درخشاں کی باتیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میں ان کی نصف بہتر ہوں۔ وہ لوگ کمتر ہوتے ہیں جو کسی کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

وہ ہانپ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔ ایک چمگادڑ کی طرح زندگی کے ویرانے میں بھٹکنے سے بہتر ہے کہ آدمی مر جائے۔ جب زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو تو جی کر کیا کرے۔ آہ، میں کتنا بدنصیب ہوں کہ میرے سامنے دریا ہے۔ میں پیاس نہیں بجھا سکتا۔ میں کب تک اسے حسرت سے دیکھتا رہوں گا۔ نہیں، مجھے مر جانا چاہئے۔

اس نے اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈالا۔ پھر وہاں سے ریوالور نکال لیا۔ وہ ریوالور ڈاکٹر نثار کے انتظار میں رکھا ہوا تھا وہی ایک شکار رہ گیا تھا جو ہاتھ نہیں آ رہا

تھا لیکن اب وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ وہ قانون کی گرفت میں ہے اور اسے بہت ہی عبرتناک سزا دی جائے گی۔ میں اس کے انتظار میں مردے سے بدتر زندگی نہیں گزار سکتا۔ درخشاں کے سایہ دیوار سے ساری عمر نہیں بہل سکتا۔

اس نے ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھی۔ پھر اس کی نال اپنی کنپٹی سے لگالی۔ آنکھیں بند کیں۔ درخشاں کو تصور میں دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی پھر اس نے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ رو رہی تھی۔ وہ راحت جان بالکل میرے بھائی جان کا ہم شکل ہے مگر میرا دل نہیں مانتا کہ میرے بھائی جان ایسے ہو سکتے ہیں۔ اچانک ریوالور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں کے لئے درخشاں گم ہو گئی اور ایک حقیقت اسے تڑپانے لگی۔ ٹھیک ہے۔ میں مر جاؤں گا۔ مرجانا بہت آسان ہے لیکن آہ، مجھے کس حیثیت سے کس قبرستان میں دفنایا جائے گا۔

اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے اندر سے ہچکیاں نکلنے لگی۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا۔ اپنی آہوں کو اور سسکیوں کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا پھر اس نے جھکتے ہوئے اپنا منہ مٹی میں چھپالیا۔ اس کے بعد وہ بے قابو ہو گیا۔ اچانک ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

☆======☆======☆

ڈی ڈی ٹی

اکثر لوگوں کو دوسروں کی بیویاں خوبصورت نظر آتی ہیں۔
وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی بیوی بھی
دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہو گی۔
دو مردوں کا شرمناک قصہ۔
وہ ایک دوسرے کی بیوی پر عاشق ہو گئے تھے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ جانا کا مطلب کہیں جانا ہوتا ہے لیکن کسی کے دل میں جا کر سمانا ہو تو اسے جاناں کہتے ہیں۔ اتفاق سے اس دل والی کا نام بھی جاناں تھا۔ پورا نام کشور جاناں، پورا جسم بظاہر موم کی طرح سخت .... بباطن پگھل جانے والا، شمع کی لو کی طرح اٹھتا ہوا قد تھا۔ صورت ایسی اجلی جیسے لَو دے رہی ہو۔ عاصم اسے دیکھتے ہی ہڑ بڑا کر عاشق ہو گیا تھا۔ افسوس کہ جاناں اسے لفٹ نہیں دے رہی تھی۔

تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ آگ کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ دو پتھروں کے ٹکرانے سے پہلے چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ پھر وہ شعلہ بنتی ہے مگر شعلۂ عشق کے لیے ضروری نہیں ہے کہ دونوں طرف برابر آگ لگتی ہو۔ یہ شعلہ صرف عاصم کے دل و دماغ میں بھڑک رہا تھا جاناں تک اس کی آنچ نہیں پہنچ رہی تھی۔ حالانکہ وہ خوش شکل، خوش لباس، خوش مزاج اور خوش قد بھی تھا لیکن جاناں خوش نہیں تھی۔ جبکہ وہ اس حد تک ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا کہ جاناں کی کلائی مروڑ سکتا تھا۔ عورت بھی یہ کب چاہتی ہے کہ اس کا مرد کسی پہلوان کی کلائی مروڑنے جائے۔ وہ تو دل و جان سے اپنی کلائی پیش کرتی ہے مگر جاناں کی کلائی عاصم کے لئے نہیں کسی اور کے لیے تھی۔

جب وہ نظریں جھکا کر تصور کی آنکھوں سے دیکھتی تو اسے اپنے دماغ کی کھڑکی سے جبران جھانکتا ہوا نظر آتا تھا۔ جبران، عاصم کی طرح خوش قد، خوش لباس، اور خوش مزاج تھا لیکن خوش شکل نہیں تھا۔ عجیب بے ڈھنگی سی صورت تھی۔ ہونٹ موٹے موٹے، ناک چپٹی اور آنکھیں بڑی بڑی انگاروں جیسی سرخ تھیں۔ کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے آئیڈیل کے چہرے پر درندگی پسند کرتی ہیں۔ اس لئے جاناں کا آئیڈیل جبران تھا اور وہی اس کے دماغ کی کھڑکی سے جھانکتا رہتا تھا۔

ایک دن عاصم نے کہا۔ ''جاناں! مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میں خوبرو ہوں۔''

وہ بولی۔ ''میں بھی خوبرو ہوں۔''

''میں دولت مند بھی ہوں۔''

''تم جانتے ہو، میں بھی دولت میں کسی سے کم نہیں ہوں۔''

''پھر کیا بات ہے؟ اور تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں وہ چاہتی ہوں جو میرے پاس نہیں ہے۔''

''تمہارے پاس کیا نہیں ہے؟''

''میرے پاس خوبصورتی ہے، بدصورتی نہیں ہے۔ میرے پاس دولت ہے، غربت نہیں ہے۔ اس لئے میرا آئیڈیل وہ ہے جو ذرا بدصورت ہو اور جو میرا محتاج بن کر رہ سکتا ہو۔''

''میں اپنی تمام دولت تمہارے نام لکھا کہ تمہارا محتاج ہو سکتا ہوں۔ دنیا کا کوئی انسان اپنی خوبصورتی مٹانا نہیں چاہتا مگر یہ عشق بری بلا ہے۔ اس کے لئے میں اپنا چہرہ بھی بگاڑ کر بدصورت بن سکتا ہوں، تمہاری خاطر۔''

''سوری عاصم! میں تمہارے جذبے کی قدر کر سکتی ہوں مگر تم سے محبت نہیں کر سکتی، شادی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میرا آئیڈیل جبران ہے۔''

''جبران؟'' عاصم نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کون جبران؟''

''وہی جبران لطیفی جو تمہاری طرح فلموں کا ڈائریکٹر ہے۔''

''ارے! وہ تو انتہائی بدصورت آدمی ہے۔ بدصورت بھی ہے اور فلاپ فلموں کا ڈائریکٹر بھی۔ اس کی فلمیں ہمیشہ ناکام ہوتی ہیں اور وہ کنگال رہتا ہے۔''

جاناں نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے اس کی یہی خوبیاں پسند ہیں۔''

''میں بھی تمہاری خاطر ناکام فلمیں بناؤں گا۔ میں کنگال بن جاؤں گا۔''

''عاصم! جس طرح تم میرے لئے دولت اور عیش و آرام کو ٹھوکر مارنا چاہتے ہو۔ اسی طرح میں جبران کے لئے ساری دنیا کو ٹھکرا سکتی ہوں۔ جو عشق کا شعلہ ہوتا ہے، وہ کسی ایک کے نام سے بھڑکتا ہے۔ تمہارے دل میں یہ شعلہ میرے نام سے ہے اور میرے دل میں یہی شعلہ جبران کے نام سے بھڑکتا رہے گا۔''

''جاناں! میں ایک سوال کرتا ہوں۔ خوب سوچ سمجھ کر جواب دو۔ کیا اپنے دماغ

میں جس کے لئے محبت ہوتی ہے۔ کیا وہ محبت، وہ آئیڈیل بدل نہیں سکتا۔ دماغ میں کوئی دوسرا نہیں سما سکتا۔''

وہ بولی۔''اگر کوئی دوسرا سما سکتا ہے تو تم اپنے دماغ میں میری جگہ کسی دوسری کو بٹھا لو۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر تمہارے سوال کا جواب تمہیں مل چکا ہے''۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔''نہیں، محبت بھی بدل سکتی ہے۔ دماغ میں کوئی دوسرا سما سکتا ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اپنے وقت پر فنا ہو جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے یا پھر اپنی جگہ بدل دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اونچے اونچے پہاڑ بھی زلزلے کے بعد زمین بوس ہو جاتے ہیں اور زمین کے کسی دوسرے حصے پر پہاڑ بلند ہو جاتے ہیں پھر انسان کے دماغ میں ایک کی جگہ کوئی دوسرا کیوں نہیں سما سکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ جبران کی جگہ میں تمہارے دماغ اور دل میں جگہ بنا سکوں۔''

جاناں نے ایک حسرت بھری سانس کھینچی۔ پھر کہا۔''میں بھی یہی کوشش کر رہی ہوں کہ جبران کے دل اور دماغ میں جو سمائی ہوئی ہے اس کی جگہ میں لے لوں۔ افسوس انسان جو چاہتا ہے وہ اسے نہیں ملتا۔ تم میری قدر کرتے ہو۔ میں تمہاری قدر نہیں کرتی، میں جبران کی قدر کرتی ہوں۔ وہ میری قدر نہیں کرتا۔''

عاصم نے پوچھا۔''وہ کسے چاہتا ہے؟''

''شبانہ کو''۔

☆======☆======☆

شبانہ کے سامنے میک اپ کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے فلم میں منظر کے مطابق میک اپ کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کا حسن میک اپ کا محتاج نہیں تھا۔ تاہم رنگین فلموں کے لئے میک اپ لازمی ہوتا ہے۔ وہ ایک رنگین فلم میں انارکلی کا رول ادا کر رہی تھی۔ فلم کا نام تھا۔''نئے دور کی انارکلی''۔

ایک اسسٹنٹ نے میک اپ روم میں آ کر اطلاع دی۔''میڈم آپ سے جبران صاحب ملنا چاہتے ہیں''۔

شبانہ نے ناگواری سے منہ بنایا۔ پھر مجبوراً بولی۔''ٹھیک ہے، انہیں یہاں بھیج دو۔''

وہ میک اپ میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور جبران لطفی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے موٹے اور بھدے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ مسکراہٹ کی وجہ سے ناک اور پھیل گئی تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔''شبانہ جی! کمال ہے آپ تو سچ مچ کی انارکلی لگ رہی ہیں۔ آپ مقابلۂ حسن میں شریک ہو جائیں تو ملکۂ حسن کا ٹائٹل آپ جیت لیں گی۔''

''شکریہ!'' شبانہ نے اپنی تعریف سے خوش ہوئے بغیر پوچھا''فرمائیے! کیسے آنا ہوا؟''

''میں کیا عرض کروں۔ آپ سے التجا تو کی تھی کہ میری فلم میں بھی ایک اچھا سا رول قبول کر لیں۔''

''دیکھئے جبران صاحب! آپ پہلے ہی انڈسٹری میں بدنام ہو چکے ہیں۔ جو فلمیں بناتے ہیں وہ ناکام ہوتی ہیں۔ میں ناکام فلموں کی ہیروئن بننا نہیں چاہتی۔''

''شبانہ جی! آپ یہ بھی تو سوچیں کہ میری فلموں میں ذہانت ہوتی ہے، شرارت نہیں ہوتی ہے۔''

''میں جوان ہوں، بوڑھی نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے ذہانت نہیں شرارت پسند ہے اور شرارتی فلمیں ہی پیسہ دیتی ہیں۔ محتاجی سے محفوظ رکھتی ہیں۔ پتہ نہیں، کیوں آپ کو محتاجی پسند ہے؟''

''میں آپ کی خاطر، آپ کے مزاج کے مطابق کامیاب فلمیں بناؤں گا۔ دولت مند بننے کی پوری کوشش کروں گا۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں آپ کو صرف اپنی فلم کی نہیں، اپنی زندگی کی بھی ہیروئن بنانا چاہتا ہوں۔''

''سوری مسٹر جبران! میں آپ کی عزت کرتی ہوں مگر آپ کے گھر کی عزت نہیں کر سکتی۔''

''آخر کیوں۔ کیا اس لیے کہ میں خوبرو نہیں ہوں۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''ایسی ہی بات ہے۔ دیکھئے خدا نے آپ کو حسن دیا ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ

جیون ساتھی بھی حسین ہو۔''

''کیوں ضروری نہیں ہے۔ اگر مرد خوبرو ہو تو عورت کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ جو حسین ہیں وہ اور زیادہ حسین، جو دولت مند ہیں، وہ اور زیادہ دولت مند بننے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ میں بھی اسی کوشش میں ہوں اور اس کے لئے میرے ذہن میں میرا اپنا ایک آئیڈیل ہے۔''

ایسا کہتے ہوئے شبانہ نے چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے تصور کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دیکھا۔ اس کے دماغ کی کھڑکی سے عاصم جھانک رہا تھا۔ وہ بے اختیار ایک ہائے کے ساتھ بولی۔''عاصم..........''

جبران نے چونک کر پوچھا۔''کیا عاصم آپ کا آئیڈیل ہے؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔''ہاں، وہ میری نیند ہے۔ میں اسے یاد کرتے کرتے سو جاتی ہوں۔ وہ میری زندگی ہے۔ اسے پانے کی توقع میں زندہ رہتی ہوں۔''

''پھر تو آپ ایک سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کشور جاناں پر مرتا ہے اور اسی کو حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔''

شبانہ نے نفرت سے کہا۔''وہ کشور جاناں کیا بیچتی ہے۔ میں ہر قیمت پر عاصم کو خرید لوں گی۔''

''وہ دولت مند آدمی ہے۔ بکنے والا نہیں ہے۔''

''میں دولت سے نہیں۔ ذہانت کے سکے سے اسے خریدوں گی۔''

جبران مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گیا، پھر بولا۔''میں آخری سانس تک آپ کی تمنا کرتا رہوں گا۔ آپ ایک بات یاد رکھیں۔ کبھی میری ضرورت پیش آئے، کسی بڑی قربانی کی ضرورت پڑ جائے تو وہ قربانی میں ہی دے سکوں گا۔ ایسے وقت میں مجھے یاد کر لینا۔''

وہ سر جھکا کر کمرے سے چلا گیا۔ شبانہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے آواز دے کر اسسٹنٹ کو بلایا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر میز پر جھک گئی۔ پھر کراہنے لگی۔ اسسٹنٹ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میڈم! کیا بات ہے؟ کیا کسی ڈاکٹر کو بلایا جائے؟''

''نہیں۔ میرے ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ میں واپس جاؤں گی۔''

اسسٹنٹ نے کہا۔''میڈم! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ شوٹنگ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ سیٹ پر آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے اگر دوا سے تکلیف دور کر لی ہو تو..........''

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ شبانہ نے اسے جھڑک کر کہا۔''بکواس مت کرو۔ جاؤ جو میں کہتی ہوں، وہ کرو۔''

وہ بے چارا وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر تمام اسٹوڈیو میں پھیل گئی کہ ہیروئن شبانہ کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ شوٹنگ نہیں ہو سکے گی۔ یہ بات جب عاصم تک پہنچی تو وہ بری طرح پریشان ہو گیا۔ اس کی فلم''نئے دور کی انارکلی'' کا بجٹ تقریباً پچاس لاکھ روپے تھا۔ اب تک وہ تیس لاکھ روپے صرف کر چکا تھا اور باقی جو فلم شوٹنگ کے لئے رہ گئی تھی، اس میں شبانہ کا بہت اہم رول تھا۔ اس کے بغیر یہ فلم مکمل نہیں ہو سکتی تھی اور وہ آئے دن اپنی بیماریوں کا بہانہ کر کے شوٹنگ ملتوی کر دیتی تھی اور بجٹ کی رقم اور بڑھا دیتی تھی۔ اسے مالی مشکلات میں گرفتار کرتی جا رہی تھی۔

عاصم پریشان ہو کر سیٹ سے باہر آیا۔ اس وقت شبانہ اپنی کار میں بیٹھنے جا رہی تھی۔ اس نے آواز دی۔''رک جاؤ شبانہ! میں شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو یہاں بلا کر تمہارا علاج کراؤں گا۔''

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، پھر بولی۔''علاج اسٹوڈیو میں نہیں، میرے گھر میں ہو گا۔ اگر تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے تو آؤ میری کار ڈرائیو کرو، میرے ساتھ گھر چلو۔ وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے۔'' یہ کہہ شبانہ نے ڈرائیور کو چھٹی دے دی۔

عاصم نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ وہ اتنی مہنگی ہیروئن تھی کہ اس کے خلاف کچھ بولنا بڑا مہنگا پڑتا۔ اس کے تیس لاکھ روپے ڈوب جاتے۔ وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کرنے کے بعد کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔''آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

''میری چاہت کو تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''شبانہ! آج میں تم سے صاف صاف کہہ دوں کہ میں تمہیں نہیں بلکہ..........''

شبانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''تم کشور جاناں کو چاہتے ہو اور یہ میری توہین ہے۔''

''میں دل سے مجبور ہوں۔''

وہ بولی۔ ''میں بھی دل سے مجبور ہوں۔''

''میں اپنی پسند کے مطابق ازدواجی زندگی گزاروں گا۔''

''تمہاری پسند جذباتی ہے۔ ذرا عقل سے سوچو۔ تم ایک کامیاب ڈائریکٹر ہو۔ میں ایک کامیاب ہیروئن ہوں۔ جب ہم ہر طرح سے کامیاب ہیں تو ہماری ازدواجی زندگی بھی نہایت ہی کامیاب ہوگی۔''

''شبانہ! کوئی سمجھوتے کی بات کرو۔''

''کیا بات کروں۔ اگر تم مجھے اپنی زندگی سے نکال رہے ہو تو اپنی فلم سے بھی نکال دو۔ کوئی دوسری انارکلی لے آؤ۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ فلم کا آدھے سے زیادہ حصہ شوٹ ہو چکا ہے۔ آخری حصے میں تمہارا اہم کردار ہے۔ اگر میں نے تمہیں نکال دیا تو شروع سے مجھے شوٹنگ کرنی ہوگی۔ مزید تیس پینتیس لاکھ روپے خرچ کرنے ہوں گے۔ کیا تم مجھے کنگال بنا دینا چاہتی ہو۔''

''میں اتنی فراخ دل ہوں کہ تمہیں اپنا حسن دے رہی ہوں۔ اپنی دولت دے رہی ہوں۔ اپنی شہرت دے رہی ہوں۔ میری وجہ سے تمہاری فلم سپر ہٹ ہوگی۔ تم تو کاروباری انداز میں سوچتے ہو۔ کاروباری انداز میں فلم بناتے ہو۔ اپنی زندگی کو کاروباری انداز میں کامیاب کیوں نہیں بنانا چاہتے؟''

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح شبانہ کو شوٹنگ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کرے اور کس طرح اسے بہلا پھسلا کر اپنی یہ فلم مکمل کر لے۔ پھر آئندہ اسے کسی فلم میں ہیروئن کا رول دینے سے توبہ کر لے۔ مگر ابھی وہ اس مصیبت سے کیسے نجات پا سکتا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

شبانہ کی کوٹھی پہنچ کر وہ چائے پینے اور ناشتہ کرنے کے دوران سوچتا رہا اور شبانہ کو پھر سے اپنے طور سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر تھک ہار کر اس نے اپنا رویہ بدل لیا۔ ایک دم سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شبانہ! آخر تم نے اپنی ضد سے مجھے جیت ہی لیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تم درست کہتی ہو۔ ہم دونوں فلمی دنیا میں بہت کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ اگر ہم شادی کر لیں تو ہماری ازدواجی زندگی کامیاب رہے گی۔''

شبانہ نے خوش ہو کر کہا۔ ''تمہارے منہ میں گھی شکر۔ میں ابھی تمہارا منہ میٹھا کراتی

ہوں۔''

وہ مٹھاس کے لئے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ عاصم نے کہا۔ ''دیکھو! میں........ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہماری فلم مکمل ہو کر جیسے ہی ریلیز ہوگی۔ ہم شادی کر لیں گے۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''نہیں، نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پہلے شادی ہوگی پھر میں تمہاری فلم کی شوٹنگ میں حصہ لوں گی۔''

''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟''

''دیکھو! ہم کاروباری لوگ ہیں۔ ہمیشہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے، والے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ اس میں اعتماد کی کیا بات ہے؟ جب ہم پکا کام کریں گے تو خود بخود اعتماد پیدا ہو جائے گا۔ پہلے شادی پھر شوٹنگ۔''

عاصم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ کاش! وہاں شبانہ کی جگہ اس کی جان جاناں ہوتی تو وہ فوراً ہی بیٹھے بیٹھے نکاح قبول کر لیتا۔ اس نے مجبور ہو کر وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔''

''ہاں، اچھی طرح سوچ لو اور یہ بات اپنے دماغ میں بٹھا لو کہ مجھ سے کوئی فراڈ نہیں چلے گا۔ شادی ہوگی تو مہر کی رقم پچاس لاکھ روپے ہوگی تاکہ تم مجھے طلاق نہ دے سکو۔ ہمارے درمیان باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوگا کہ تم میرے بعد دوسری شادی نہیں کرو گے۔''

وہ بولتی رہی اور وہ سنتا رہا۔ اس کے بعد وہ اس کی کوٹھی سے چلا آیا۔ راستے میں سوچتا رہا۔ وہ اپنی جاناں کی خاطر ساری دولت لٹا سکتا تھا جو تیس لاکھ روپے خرچ ہوں گے اس پر مٹی ڈال سکتا تھا۔ شبانہ کو ٹھکرا سکتا تھا لیکن بات صرف تیس لاکھ روپے کی نہیں تھی۔ اپنی کاروباری ساکھ کی اہمیت کی تھی۔ اگر وہ پھر سے کوئی نئی ہیروئن لے کر تیس لاکھ روپے کے نقصان پر دوبارہ شوٹنگ شروع کرتا تو دوسرے فلمساز آئندہ اس کی فلموں میں اپنی رقم نہ لگاتے۔ تمام صوبے کے تقسیم کار اس کی فلم اسی لئے خرید رہے تھے کہ اس کی ہیروئن شبانہ تھی۔ اگر شبانہ نکال دی جاتی تو اس کی فلم کوئی نہ خریدتا اور فلم ڈبے میں بند پڑی رہتی۔

وہ یہ نقصان بھی برداشت کر سکتا تھا۔ جاناں کی خاطر بالکل ہی کنگال بن سکتا تھا۔ اپنی شہرت کو بھی خاک میں ملا سکتا تھا لیکن اس بات کی ضمانت ملنی چاہئے تھی کہ اس کے بعد

جاناں اسے قبول کر لیتی لیکن وہ حور تو جبران جیسے لنگور کی دیوانی تھی۔ عاصم اپنی کاروباری ساکھ بگاڑنے کے بعد نہ گھر کا رہتا نہ گھاٹ کا۔

☆======☆======☆

جبران نے جو فلم بنائی تھی اس کا نام ''بیٹی'' تھا اور وہ فلم بھی فلاپ ہو چکی تھی۔ اس کا فلمساز جبران کو بے بھاؤ کی سنا رہا تھا۔ ''تم بیٹی اور بہن کے نام سے کیوں فلمیں بناتے ہو۔ کون دیکھے گا، ان فلموں کو؟ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ کوئی پھڑکتی ہوئی فلم بناؤ۔ فلم کا نام رکھو، البیلی نار، یا جوانی کے شعلے یا محبت ہائے محبت۔''

جبران نے فلمساز سے کہا ''چوہدری صاحب! البیلی نار آخر کسی کی بیٹی ہی ہوگی۔ جوانی کے شعلے میں کسی بہن کی جوانی کو ہی دکھایا جائے گا۔ محبت ہائے محبت میں ہم اپنی بہو بیٹیوں کا ہی فسانہ سنائیں گے اور مشرقی تہذیب پر کیچڑ اچھالیں گے۔ کیا یہ ہمیں زیب دیتا ہے؟''

فلم ساز نے غصے سے کہا۔ ''لعنت ہے تم پر۔ اب تک تمہیں عقل نہیں آئی۔ ساری رقم ڈبو دی۔ میں تم سے اپنا نقصان پورا کروں گا۔''

''چوہدری صاحب! اور کیا نقصان پورا کریں گے۔ میں نے فلم بنانے سے پہلے اپنا مکان آپ کے نام لکھ دیا تھا۔ یہی میرے پاس ایک ضمانت تھی کہ فلم کامیاب ہوگی تو اپنا مکان بھی آپ سے واپس لوں گا اور اپنا معاوضہ بھی آپ سے وصول کروں گا لیکن میں دونوں سے گیا۔''

''ابھی اور گڑھے میں جاؤ گے۔ ابھی فاقے کرو گے۔ کوئی فلمساز تمہیں نہیں پوچھتا ہے۔ کیا ہوا؟ وہ غفار سیٹھ تمہاری نئی فلم میں رقم لگانے والا تھا۔''

جبران خان نے کہا۔ ''جی ہاں! غفار کی شرط یہ تھی کہ میری نئی فلم میں شبانہ ہیروئن رہے لیکن شبانہ نے میری فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔''

''ارے! اتنی مشہور ہیروئن، کیا تمہاری ناکام ہونے والی فلموں میں کام کرے گی؟ تمہیں تو اب کوئی ایکسٹرا گرل بھی نہیں پوچھے گی۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فلمساز نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو! میں فلم ساز چوہدری رحمت الٰہی بول رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی آواز سننے لگا۔ پھر جلدی سے خوش ہو کر بولا۔ ''ارے آپ میڈم شبانہ ہیں۔ زہے نصیب، آپ نے مجھے یاد کیا۔ فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

وہ پھر دوسری طرف سے ہونے والی بات سننے لگا، اور حیرانی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے جبران کا منہ تکنے لگا۔ پھر اس نے ریسیور کو جبران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میڈم شبانہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

جبران نے ریسیور لے کر کہا۔ ''ہیلو میڈم! فرمائیے آپ نے کیسے یاد کیا؟''

''میں تمہیں یہ اطلاع دینا چاہتی ہوں کہ وہ جو کشور جاناں ہے۔ وہ تمہاری نئی فلم میں رقم لگانا چاہتی ہے۔ اگر تم اس کی رقم سے فلم بنانا منظور کر لو، تو میں اس فلم میں ہیروئن کا رول ادا کروں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

جبران نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں ابھی کشور جاناں سے جا کر ملتا ہوں اور شام تک آپ کے پاس آکر کنٹریکٹ سائن کروں گا۔''

دوسری طرف شبانہ ریسیور کان سے لگائے اس کی باتیں سن رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ان دنوں فلمساز چوہدری رحمت الٰہی کے دفتر میں بیٹھا رہتا ہے اور اس سے باتیں سنتا رہتا ہے۔ شبانہ دور تک چالیں چل رہی تھی۔ پہلے اس نے کشور جاناں سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ اگر وہ جبران لطیفی کو پسند کرتی ہے اور اسے اپنی گرفت میں رکھنا چاہتی ہے تو اس کی نئی فلم میں رقم لگائے۔ اس پر کشور جاناں راضی ہو گئی تھی۔ تب شبانہ نے فون کے ذریعے ابھی جبران سے رابطہ قائم کیا تھا اور اسے کشور جاناں کے گھر کا راستہ دکھا رہی تھی۔ اس نے جبران سے کہا۔ ''میں ایک شرط پر تمہاری فلم کا کنٹریکٹ سائن کروں گی اور وہ شرط یہ ہے کہ تمہاری فلم کی فنانسر کشور جاناں ہو۔ کوئی اور رقم لگائے گا تو میں کام نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

دوسری طرف جبران کی سمجھ میں نہیں آیا کہ شبانہ ایسی شرط کیوں پیش کر رہی ہے۔ جب وہ کشور جاناں کے پاس پہنچا تو ایک نئے مسئلے میں الجھ گیا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ کشور جاناں اس پر مہربان ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کی فلم میں لاکھوں روپے لگا سکتی ہے۔

جب جاناں سے فلم کے معاملے میں بات شروع ہوئی تو وہ فلم کے موضوع سے ہٹ کر محبت کے موضوع پر آ گئی۔ جبران اس موضوع سے کترا کر پھر فلم کی طرف جانا چاہتا تھا۔
جاناں نے کہا۔ ”دیکھو جبران! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ تم مجھے فائدہ پہنچاؤ گے تو میں تمہیں فائدہ پہنچاؤں گی لیکن اس کے لیے آپس کا اعتماد ضروری ہے۔ اعتماد کے لئے اعتماد والا رشتہ لازمی ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ میرا دل شبانہ کی طرف مائل ہے۔“

”کیا شبانہ تمہاری فلم میں رقم لگا سکتی ہے۔ کیا وہ تمہیں ڈوبنے سے بچا سکتی ہے۔ تم فلم سازوں کے قرض دار ہو۔ تمہارا مکان گروی ہے یہ ساری باتیں مجھے معلوم ہو چکی ہیں اور ان ساری مصیبتوں سے میں تمہیں نجات دلا سکتی ہوں۔ جو تمہارے لئے اتنا کر رہی ہے۔ کیا تم اس کی محبت کا، خلوص کا اندازہ نہیں کر سکتے۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ جاناں نے کہا۔ ”بچپن میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ جوانی میں میرے والد چل بسے۔ انہوں نے میرے لئے بے انتہا دولت چھوڑی ہے۔ بے انتہا بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آتے ہیں لیکن میں تمہاری خاطر ٹھکرا رہی ہوں۔ تمہارے سامنے ایک لڑکی ہو کر زبان کھول رہی ہوں۔ اسے میری بے شرمی کہہ لو یا محبت کا تقاضا میں نے بہت عرصے تک انتظار کیا کہ تمہاری طرف سے پیش قدمی ہوگی مگر تم میری طرف نہ آئے تو میں تمہاری طرف بڑھ رہی ہوں۔“

جبران خاموشی سے اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھنے لگا۔ وہ بہت ہی مہنگا ماحول تھا۔ اس کے سامنے جو دولت مند دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اتنی قیمتی تھی کہ بڑے بڑے دولت مند گھرانوں کے لوگ اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا ڈرائنگ روم ایسے قیمتی آرائشی سامان سے سجا ہوا تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شبانہ اگرچہ دولت مند تھی لیکن جاناں کے مقابلے میں کمتر تھی۔ اس کے باوجود وہ جاناں جیسی دولت مند عورت کو تو حاصل کر سکتا تھا لیکن شبانہ کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے دماغ نے سمجھایا کہ ڈوب کر مر جانے سے اور قرض داروں کے سامنے ذلت کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ جاناں کے خلوص اور محبت کے جذبوں کی قدر کی

جائے۔ اس کے پاس اتنی دولت ہوگی کہ وہ بیک وقت کئی فلموں کا ہدایت کار اور فلم ساز بن جائے گا اور سب سے اہم بات یہ کہ شبانہ اسے کمتر سمجھتی ہے۔ جاناں سے شادی کے بعد وہ شبانہ سے برتر ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں شبانہ پچھتائے اور خود اس کے پیچھے دوڑی چلی آئے۔

اس نے کہا۔ ”جاناں! میں تمہاری محبت اور خلوص کی قدر کرتا ہوں۔ جب نصیب جاگ رہے ہوں تو تھپک کر سلانا دانش مندی نہیں ہے۔ آج سے میری محبت اور توجہ صرف تمہارے لئے ہوگی۔ تم چاہو تو اپنے اطمینان کے لئے شادی سے پہلے بڑی سے بڑی مہر کی رقم لکھوا سکتی ہو۔ تاکہ میں کسی بھی مرحلے میں تمہیں دھوکہ دینے کی جرأت نہ کروں۔“
اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں مہر کی رقم نہیں لکھواؤں گی۔ جو تم بولو گے وہی مجھے منظور ہوگا۔ میں آنکھیں بند کر کے تم پر اعتماد کرتی ہوں اور اپنی ساری زندگی تمہارے حوالے کرتی ہوں۔“

وہ مسکراتے ہوئے جو کچھ زبان سے بول رہی تھی اس کے دل اور دماغ میں وہ بات نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ پہلے ہی یہ سوچ چکی تھی کہ مہر کی رقم بہت ہی حقیری ہوگی۔ البتہ وہ جبران کو فلم بنانے کے لئے جو بھاری رقمیں دے گی۔ اس کے لئے باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوگا اور بھاری رقمیں جبران کو قرض کے طور پر دی جائیں گی اور یہ تو سبھی جانتے تھے کہ اس کی فلمیں ہمیشہ ناکام رہتی ہیں۔ بزنس نہیں کر سکتیں نہ منافع ہوگا۔ نہ جبران کبھی دولت مند بن سکے گا اور نہ ہی کبھی جاناں کا قرض ادا کر سکے گا۔ اس لئے وہ ایک قرضدار شوہر کی حیثیت سے ہمیشہ وفادار رہے گا۔

☆======☆======☆

عاصم کشمکش میں تھا۔ اُدھر جاناں کی محبت اسے کھینچ رہی تھی۔ ادھر شبانہ اسے مجبور کر رہی تھی۔ کتنے ہی دنوں سے شوٹنگ رکی ہوئی تھی۔ فلم میں جو سرمایہ لگا ہوا تھا وہ ڈوب رہا تھا، فلمساز اسے پریشان کر رہے تھے۔ تمام سرکٹ کے تقسیم کار اس سے فلم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس نے ریلیز کی جو تاریخ مقرر کی تھی اس کے مطابق وہ فلم مکمل کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شبانہ نے سارا کاروبار الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔
ایسے ہی وقت جاناں اور جبران کی شادی کا دعوت نامہ اسے موصول ہوا۔ اس

دعوت نامے کو پڑھ کر اسے یقین نہیں آیا کہ اس کی محبت اس طرح اچانک ہی اس سے چھن رہی ہے۔ اگلے ہفتے شادی کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ وہ ایک دم سے تڑپ گیا۔ بے چین ہو کر سوچنے لگا کہ کس طرح یہ شادی روکی جاسکتی ہے وہ نہ تو اپنی دولت سے اور نہ ہی طاقت سے جاناں کو حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی عاجزی سے، گڑگڑا کر اس کے دل میں اپنے لئے جگہ بنا سکتا تھا۔ شادی کے سلسلے میں دعوت نامے چھپ چکے تھے، تقسیم ہو چکے تھے۔ ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔

شبانہ نے اس سے کہا۔ ''اب تمہارے پاس سوچنے کے لئے اور سمجھنے کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ تمہارے سامنے ایک ہی راستہ کھلا ہوا ہے اور وہ راستہ میری طرف آتا ہے۔''

عاصم کو تقدیر کے اس فیصلے کے سامنے جھکنا پڑا۔ اگلے ہفتے جاناں اور جبران کی شادی ہوگئی۔ جب اسے یقین ہوگیا وہ پرائی ہو چکی ہے تو وہ بھی شبانہ کے ہاتھوں پرایا ہوگیا۔ رونے اور مچلنے والے بچے کو جب کوئی نیا کھلونا ملتا ہے تو وہ وقتی طور پر بہل جاتا ہے۔ شبانہ نے عاصم کو بہلا لیا۔ پھر عاصم نے بھی محسوس کیا کہ شبانہ بہت اچھی بیوی ہے۔ چالاک ہے مگر وفادار ہے اور اس سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتی ہے۔ ایک بار اس نے باتوں ہی باتوں میں یہ بتایا کہ جبران اس پر بری طرح مرتا تھا اور اب بھی وہ اسے ایسی ہی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے پالینے کی حسرت میں اب تک مبتلا ہو۔

یہ سن کر عاصم کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے کہا۔ ''میں اسے گولی ماردوں گا۔''

شبانہ نے کہا۔ ''اسے گولی مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ جبران کے لئے کیا یہ ذلت کافی نہیں ہے کہ میں اس کے آگے گھاس بھی نہیں ڈالتی۔''

عاصم اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ شبانہ اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی ہے۔ واقعی یہ جبران کے لئے ایک ذلت آمیز بات تھی بشرطیکہ کوئی مرد یہ سمجھے کہ عورت لفٹ نہ دے تو آئندہ اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہئے لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو حاصل نہ ہونے والی کے پیچھے ہی بھاگتے رہتے ہیں۔

عاصم نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس کے منہ سے جو گولی مار دینے والی بات نکلی ہے تو یہ بات کسی طرح پوری ہو جائے اور جبران گولی کا نشانہ بن جائے۔ کسی طرح اسے موت آجائے تو............

تو اس کے لئے پھر ایک بار جاناں تک پہنچنے کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

اس خیال سے ہی عاصم کی نگاہوں کے سامنے جاناں کا سراپا آ گیا۔ کیا حسن تھا۔ کیا دلکشی تھی جب بھی تصور میں آتی تھی نگاہوں کو للچاتی تھی دل کو تڑپاتی تھی اور اس کے لئے ایک چیلنج بن جاتی تھی کہ آؤ اور مجھے حاصل کرلو۔ یہ جو چیلنج ہوتا ہے، یہی مرد کو دیوانہ بنا کر پرائی عورت کے پیچھے بھگاتا ہے۔

عاصم کو اس بات پر غصہ آیا تھا کہ جبران اس کی بیوی کو للچائی ہوئی نظروں سے کیوں دیکھتا ہے۔ اب وہ خود جبران کی بیوی کو للچا للچا کر تصور میں دیکھ رہا تھا تو اسے اپنی یہ غلطی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے ہاں کا دستور یہ ہے کہ ہم غیر کی بیوی کو چاہیں تو یہ شاعرانہ رومانس ہے اور کوئی ہماری بیوی کو چاہے تو یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

بہر حال عاصم کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جاناں کے دماغ سے اس کے آئیڈیل کو نکال پھینکنا چاہیے۔ اس آئیڈیل کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہیے۔ جاناں نے اس کی قدر نہیں کی اب وہ جاناں کو اسی طرح تڑپا سکتا ہے کہ جبران کو کسی طرح بھی اس دنیا سے رخصت کردے۔

اگر عاصم کی دوستی ملک الموت سے ہوتی تو وہ کہتا، دوست میرے اس دشمن کو اپنے ساتھ لے جاؤ لیکن دوست ہو یا دشمن، کوئی وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ وقت سے پہلے مارنا پڑتا ہے اور عاصم میں کسی کو قتل کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ پہلا خیال اس کے دماغ میں یہی آیا کہ کسی کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کی جائیں۔

وہ بحیثیت ڈائریکٹر ایسی ہی ایک فلم بنا چکا تھا جس میں کرائے کے قاتل کا کردار تھا۔ اس فلم میں اس نے یہ کہانی پیش کی تھی کہ جو شخص کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کرتا ہے آخر میں وہ خود کرائے کے قاتل کے ہاتھوں بلیک میل ہونے لگتا ہے۔ دانشمندی یہی ہوتی کہ رقیب کسی طرح قتل ہو جاتا اور قتل کی اس واردات کا کوئی رازداں نہ ہوتا۔

اس کے منصوبے بنانے کے دوران یہ خبر ملی کہ کشور جاناں نے اپنا تمام کاروبار شہداد پور منتقل کر دیا ہے اور جبران کو لے کر وہاں چلی گئی ہے۔ شہداد پور اس شہر سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا عاصم تلملا کر رہ گیا۔ پھر اس کے دماغ نے سمجھایا۔ یہ تو اور اچھا ہوا۔ رقیب بہت دور چلا گیا ہے۔ اگر وہ سو میل کے فاصلے پر مرجائے تو اس کی موت کے سلسلے

میں کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکے گا، لیکن جبران کو موت آئے گی کیسے؟

عاصم نے آخر اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ خود یہ کام کرے گا۔ اس نے ایک کیمسٹ کے ہاں سے زہر حاصل کیا۔ ارادہ تھا کہ موقع ملا تو جبران کے کھانے یا پینے کی کسی چیز میں زہر دیا جائے گا۔ پھر اس نے احتیاطاً ایک چاقو اپنے پاس رکھا کہ حوصلہ ہوا تو وہ چاقو بھی استعمال کرے گا۔ اس کے علاوہ اس بات کی بھی توقع تھی کہ کہیں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کسی پہاڑی علاقے میں جبران جائے گا تو اسے کسی کھائی میں دھکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ طرح طرح کے منصوبے بنا رہا تھا اور ان منصوبوں کے مطابق چپ چاپ تیاریاں بھی کر رہا تھا۔

چھ ماہ گزر گئے۔ ایک رات وہ شوٹنگ سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ شبانہ نے فون پر اطلاع دی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لئے فوراً ہی گھر چلا آئے۔ اسے شبانہ سے اتنی محبت اور وفائیں مل رہی تھیں کہ وہ بھی اس کا وفادار بن گیا تھا۔ اس کی ہر بات پر بڑی خوشی سے اور بڑی محبت سے عمل کرتا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ دماغ کے چور گوشے میں جاناں کا ہی خیال سمایا رہتا تھا۔ اسٹوڈیو سے اس کی کوٹھی تک کا فاصلہ تقریباً سات میل تھا۔ اس دوران اسے ایک قبرستان کے قریب سے گزر کر جانا پڑتا تھا، وہ علاقہ بہت ہی ویران اور سنسان رہتا تھا۔ جب وہ اُدھر سے گزر رہا تھا تو اچانک ہی ایک گاڑی نے سامنے آ کر اس کا راستہ روک لیا۔

سامنے والی گاڑی کی ہیڈ لائیٹس سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس نے راستہ روک رکھا ہے۔ اس نے کار کا ہارن بجایا۔ سامنے والے کو ہٹنے کا اشارہ کیا لیکن گاڑی اسی طرح راستہ روکے کھڑی رہی۔ تب وہ جھنجلا کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلا اسی وقت دوسری گاڑی کا بھی دروازہ کھلا اور اس گاڑی کا مالک بھی باہر آ گیا۔ تب ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں اسے جبران کا چہرہ نظر آیا۔

عاصم سوچ بھی نہیں سکتا تھا جسے قتل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے اور جسے قتل کرنے کے لیے وہ دو سو میل فاصلہ طے کر کے شہداد پور جانے کا کوئی موقع تلاش کر رہا تھا تو وہی خود شہداد پور سے چل کر اس کے سامنے آ جائے گا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم شہداد پور سے کب آئے؟ اور اس طرح میرا راستہ کیوں روکا ہے؟''

جبران نے اپنی بتیسی دکھاتے ہوئے اور سفاکانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہے کہ پہلے ہم اپنی اپنی گاڑی کی ہیڈ لائیٹس بجھا دیں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف گیا اور اس کی روشنیاں گل کر دیں۔ دوسری طرف عاصم نے بھی اپنی کار کی ہیڈ لائیٹس کو خاموش کر دیا...... یکبارگی چاروں طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر نہیں آئے۔ ایک دوسرے کی صرف آوازیں سنتے رہے۔ جبران کہہ رہا تھا۔ ''میں بہت دنوں سے تمہاری تاک میں تھا۔ مجھے جاناں نے بتا دیا ہے کہ تم اس پر میلی نظر رکھتے ہو اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ میری وفادار بیوی ہے۔ میں کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے۔ اس لیے میں تمہاری آنکھیں نکالنے آیا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آنکھیں نکالتے وقت تمہاری موت واقع ہو جائے۔''

عاصم نے بہت ہولے ہولے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اتفاق سے میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ تم میری بیوی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہو۔ تمہاری بیوی سے زیادہ میری بیوی وفادار ہے۔ بہت شرم والی ہے مجھ جیسے عزت دار کی شریکِ حیات ہے۔ میں کبھی تمہاری میلی نگاہوں کو اس کے لئے برداشت نہیں کروں گا۔ اس لئے آج تمہارا کام تمام کر دوں گا۔''

جبران کی آواز قریب آنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم مجھے اس لئے نہیں مارو گے کہ میں تمہاری بیوی کا عاشق ہوں بلکہ اس لئے مارو گے کہ میرے مرنے کے بعد شاید تم جاناں کو حاصل کر سکو۔''

جبران نے اسے گھونسہ مارنا چاہا۔ عاصم نے اس کے ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑ لیا۔ پھر اس نے گھونسہ مارنا چاہا تو جبران نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف زور لگانے لگے۔ جبران نے کہا۔ ''اس وقت ہم دونوں ایسے غیرت مند ہیں کہ اپنی بیوی کی عزت کے لئے عزت کے دشمن کو مار ڈالنا چاہتے ہیں اور اس وقت ہم دونوں ایسے بے غیرت ہیں کہ ایک پرائی عورت کو حاصل کرنے کے لئے اس کے شوہر کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اپنا اپنا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔''

عاصم نے زور لگا کر اسے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے یہ کوئی نہیں جانتا کہ ابھی یہاں کس کی لاش گرے گی، اور کون فاتح بن کر اپنی بیوی کا بھی رہے گا اور

اپنی محبوبہ تک بھی پہنچے گا۔ یہ ہم میں سے کسی کا آخری وقت ہے۔ اس لئے اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہم دونوں غیرت مند بھی ہیں اور بے غیرت بھی۔''

یہ کہتے ہی عاصم نے اسے ایک زور کی لات ماری۔ وہ لڑکھڑا کر جھک گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر جوابی حملہ کیا تو عاصم سنبھل نہ سکا۔ مار کھا کر پیچھے چلا گیا۔ جب وہ دوسری بار آگے بڑھا تو اس وقت تک وہ اپنی جیب سے چاقو نکال چکا تھا۔ جبران اندھیرے میں چاقو نہ دیکھ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ چاقو اس کے پیٹ میں دھنس گیا تھا۔ خنجر زنی کے لئے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سمجھنا ہوتا ہے کہ چاقو کو جسم کے کس حصے میں پیوست کیا جائے تو فوری موت واقع ہوتی ہے اور کس حصے میں چاقو سے حملہ کیا جائے تو دشمن تڑپ تڑپ کر ٹھہر ٹھہر کر مرتا ہے اور کس حصے میں چاقو پیوست ہو تو دشمن زخمی تو ہوتا ہے لیکن مرتا نہیں ہے۔ عاصم کو اتنی معلومات حاصل نہیں تھیں۔

چاقو کا زخم کھاتے ہی جبران پیچھے چلا گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر ٹھائیں سے فائر کر دیا۔ چاقو کا زخم ایسا تھا کہ گولی صحیح نشانے پر نہ بیٹھ سکی۔ عاصم فائرنگ کی آواز سنتے ہی بوکھلا گیا تھا اور وہاں سے پلٹ کر بھاگنے لگا تھا۔ دوسری بار پھر گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ تاریکی آڑے آرہی تھی۔ وہ کہیں بھاگ رہا تھا، گولی کہیں جارہی تھی۔ تھوڑی دور تک بھاگتے رہنے کے بعد وہ رک گیا۔ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ اتنی دور چلا آیا تھا کہ اندھیرے میں اب وہ دونوں گاڑیاں نظر نہیں آرہی تھیں۔ جبران بھی اندھیرے میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ پتہ نہیں وہ مر چکا تھا یا ہاتھ میں ریوالور لئے اس کی تاک میں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا کرے؟ عقل اسے سمجھا رہی تھی کہ جبران اگر مر چکا ہے تو اس کی لاش کے پاس کار کو چھوڑ کر جانا دانش مندی نہیں ہے۔

اس نے حوصلہ کیا۔ پھر دبے قدموں واپس اپنی گاڑی کی طرف جانے لگا۔ اس کے دل پر دہشت طاری تھی۔ ہر قدم پر یوں لگتا تھا کہ جیسے جبران پیچھے سے آ کر حملہ کر رہا ہے۔ وہ پلٹ پلٹ کر دیکھتا تھا اور دائیں بائیں بھی دیکھنے کے بعد محتاط ہو کر آگے بڑھتا تھا۔ آخر وہ اپنی کار کے پاس آ گیا۔

اتنی دیر میں وہ تاریکی کا عادی ہو گیا تھا۔ اب اسے کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ سامنے جبران کی گاڑی دکھائی دے رہی تھی اور دونوں گاڑیوں کے بیچ کچے راستے پر جبران کی لاش

پڑی ہوئی دکھائی دی۔ پہلے تو وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر گم صم رہ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ خیال تھا کہ اس میں جان ہوگی تو وہ اٹھے گا لیکن وہ ساکت پڑا رہا۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ جبران میں اگر ذرا سی بھی جان ہوتی تو چاقو کا زخم اسے کراہنے پر مجبور کرتا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بالکل مر چکا ہے۔

عاصم نے اپنی گاڑی کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر دروازے کو بند کرتے ہوئے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کی تاکہ دشمن زندہ ہو تو بھاگنے میں آسانی رہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہیڈ لائیٹس آن کیں تب ان کی روشنی میں جبران کی لاش صاف طور نظر آئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور پیٹ پر سے اس کا لباس خون سے بالکل بھیگا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جو ریوالور تھا وہ قریب ہی سڑک پر پڑا ہوا تھا اور وہ ریوالور اکیلا نہیں تھا اس کے پاس چاقو بھی نظر آرہا تھا۔ عاصم وہاں زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکا۔ فوراً ہی گاڑی کو پیچھے کی طرف لے گیا پھر راستے سے نیچے اتار کر جبران کی گاڑی کو کراس کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ بہت دور جانے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہاں اپنا چاقو چھوڑ کر نہیں آنا چاہتے تھا اور اگر چھوڑنا ہی تھا تو اس کے دستے پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا دینے چاہئیں تھے۔ ایک تو اس نے کبھی قتل جیسا جرم نہیں کیا تھا۔ دوسرے اس پر بوکھلاہٹ طاری تھی۔ وہ بدحواسی میں ہر بات پر غور نہیں کر سکتا تھا اور عادی مجرموں کی طرح اپنے بچاؤ کی تدابیر پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے جو عادی مجرم اور قاتل ہوتے ہیں وہ بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی کر ہی بیٹھتے ہیں۔

جب وہ بدحواس سا ہو کر اپنی کوٹھی میں پہنچا تو ڈرائنگ روم میں شبانہ کو اپنا منتظر پایا پہلے تو وہ مسکرا رہی تھی۔ پھر عاصم کو دیکھتے ہی ایک دم سے پریشان ہو کر اور گھبرا کر بولی۔ ''یہ کیا؟ تمہارے لباس پر سرخ رنگ کے چھینٹے نظر آرہے ہیں۔ کیا خون ہے؟''

وہ اور زیادہ گھبرا گیا۔ جلدی سے اپنے لباس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شبانہ! میں نے قتل کر دیا ہے۔''

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''کیا.......... کیا کہا تم نے؟ کسے قتل کیا ہے؟''

''جبران کو۔''

میں تمہیں بار بار منع کرتی تھی کہ رقابت کی آگ میں نہ جلو جب میں تمہاری وفادار ہوں تو تمہیں اپنے رقیب کو قتل کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟''

"دیکھو! میری باتوں کو سمجھو۔ میں اس کے پاس نہیں گیا تھا۔ وہی میرا راستہ روکنے آ گیا تھا۔ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی حملہ کرنا پڑا۔"

شبانہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہائے بیچارا جبران۔"

عاصم نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم میرے دشمن سے ہمدردی کر رہی ہو۔ اس کے مرنے کا افسوس کر رہی ہو؟"

"کیا افسوس نہیں ہوگا۔ وہ بھی تو انسان تھا۔ وہ بھی جان رکھتا تھا کسی کی جان لینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب یہاں کھڑے نہ رہو کوئی ملازم آ گیا تو وہ بھی دیکھ لے گا۔ جلدی سے جا کر باتھ روم میں یہ لباس اتارو۔ دوسرا پہن لو۔ میں اسے دھو ڈالوں گی۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف جانے لگا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو شبانہ سوچتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہوں میں جبران کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا مطالبہ یاد آ رہا تھا۔ "شبانہ! میں تمہیں چاہتا ہوں تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دے سکتا ہوں۔ کبھی ضرورت پڑے تو مجھے آزما لینا۔"

مرد چاہے پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ ہو۔ عورت اس کی وہ بات ضرور یاد رکھتی ہے جو اس کی شان میں کہی گئی ہو۔ جبران نے اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس کے کام آئے گا اور جبران جیسا بھی تھا اس کا پروانہ تھا۔ پروانہ جب جل کر شمع کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتا ہے تب شاید شمع روتے روتے صبح کر دیتی ہے۔

شبانہ ایسی تو نہ تھی کہ جبران کے لئے روتی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر بیڈروم میں آئی۔ عاصم نے لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "شبانہ! میں یہاں نہیں رک سکتا۔ کچھ دنوں کے لیے باہر چلا جاؤں گا۔ اگر یہاں کسی نے جبران کے متعلق کوئی سوال کیا تو شاید بدحواسی میں میری زبان سے سچی بات نکل آئے۔ اس لئے مجھے اپنے آپ پر قابو پانے کے لئے کچھ روز یہاں سے دور رہنا چاہئے۔"

شبانہ نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "میرا بھی یہی مشورہ ہے۔ تم بہت زیادہ پریشان ہو اور خوف زدہ بھی۔ ابھی دو بجنے والے ہیں۔ ڈھائی بجے ایک ٹرین یہاں سے شہداد پور کی طرف جاتی ہے۔ تم اس ٹرین سے چلے جاؤ۔ یہاں تمہارے متعلق کسی نے اگر کچھ پوچھا تو

میں اسے جواب دے لوں گی۔"

دس منٹ کے بعد ہی وہ دونوں کار میں بیٹھے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ شبانہ کار ڈرائیو کر رہی تھی اور اسے سمجھا رہی تھی کہ وہ بالکل نہ گھبرائے۔ عاصم اس لئے گھبرا رہا تھا کہ جائے واردات پر اس کا چاقو رہ گیا تھا اور یہ بات وہ شبانہ کو نہیں بتا رہا تھا۔ خواہ مخواہ وہ اور ناراض ہوتی اور اسے طعنے دیتی۔ اس نے کہا۔ "میں شہداد پور پہنچ کر ہوٹل ڈیلا ئیلا میں قیام کروں گا۔ ڈائریکٹری میں اس ہوٹل کا فون نمبر ہے۔ تم فون کے ذریعے رابطہ قائم کر کے یہاں کے حالات بتاتی رہنا۔ جب کوئی خطرہ نہیں ہوگا تو میں واپس آ جاؤں گا ورنہ شہداد پور سے بھی کہیں دور نکل جاؤں گا۔"

شبانہ اسے حوصلہ دیتی رہی۔ گاڑی ذرا لیٹ آئی۔ وہ پونے تین بجے گاڑی میں سوار ہو کر شبانہ سے رخصت ہو کر شہداد پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے وہ اس خیال سے تھر تھر کانپ رہا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک انسان کی جان لی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بظاہر پُرسکون ہو گیا تھا لیکن اندر سے اب بھی کپکپی طاری تھی۔ قانون کا خوف دل میں سمایا ہوا تھا۔ شبانہ کے ساتھ آتے ہوئے راستے میں پلیٹ فارم پر ٹرین میں جہاں کہیں کوئی پولیس والا نظر آتا تو وہ ایک دم سے سہم کر سمٹ جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے اندر ایک چھپی چھپی خوشی تھی اور وہ چور خوشی یہ تھی کہ وہ جاناں کے شہر شہداد پور جا رہا ہے۔ پولیس اور قانون کا خوف دور ہوتے ہی وہ پہلی فرصت میں جاناں سے ضرور ملے گا۔ بہت عرصے کے بعد صورتِ جاناں دیکھے گا۔

صبح پانچ بجے وہ شہداد پور پہنچ گیا۔ ہوٹل ڈیلا ئیلا میں اسے تیرہ نمبر کا کمرہ ملا۔ اکثر انگریزوں اور خصوصاً امریکی باشندوں کی نظر میں تیرہ نمبر بہت ہی منحوس ہوتا ہے۔ اسی لئے جہاں جہاں امریکن اپنا ہوٹل تعمیر کرتے ہیں۔ وہاں اس ہوٹل میں تیرہ نمبر کا کمرہ کبھی نہیں رکھتے وہ کسی دیسی باشندے کا ہوٹل تھا۔ نام بدیسی رکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ منحوس نمبر کا کمرہ وہاں موجود تھا۔ عاصم نے کاؤنٹر کیپر اور منیجر وغیرہ سے کہہ دیا تھا کہ جب بھی اس کے نام کوئی فون آئے تو فوراً ہی اس کے کمرے کے ٹیلی فون سے رابطہ ملا دیا جائے۔ وہ سو رہا ہو تب بھی اسے جگا دیا جائے۔

وہ تیرہ نمبر کے کمرے میں آیا تو اس کے اندر عجیب سی گھبراہٹ تھی۔ دل و دماغ میں

قانون کا خوف تھا۔ آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا نظر آتا تھا۔ اس کے ایک وہم نے اسے جکڑ لیا تھا کہ وہ منحوس کمرے میں آ گیا ہے۔ وہ بے چینی سے اس کمرے کے اندر ٹہلتا رہا۔ ایک بار بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ صبح آٹھ بجے اس نے ہوٹل کے ٹیلی فون ایکسچینج کے ذریعے شبانہ سے رابطہ قائم کیا۔

اس کی آواز سنائی دی۔ ''عاصم اچھا ہوا۔ تم نے فون کیا۔ میں ابھی ڈائریکٹری میں ہوٹل ڈیلا ئیلا کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔''

عاصم نے کہا۔ ''شبانہ! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے جلدی سے بتاؤ کہ کیا وہاں سے مجھے کوئی پوچھنے آیا تھا؟''

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ کم از کم فون پر کسی قسم کی بھی پریشانی کا ذکر نہ کرو۔ تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہاں تمہیں کوئی پوچھنے نہیں آیا تھا، اور ایک اہم بات سنو۔ میں صبح چھ بجے اُدھر قبرستان کے پاس سے گزر رہی تھی۔ دانستہ وہاں گئی تھی۔ وہاں تو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ نہ وہ گاڑی تھی، نہ اور کوئی تھا۔ راستہ بالکل صاف تھا۔ تم نے میرے سامنے جو کچھ بیان کیا اس کے مطابق وہاں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔''

عاصم نے حیرانی سے کہا۔ ''تعجب ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں۔ میں اس توقع سے گئی تھی کہ وہاں بھیڑ لگی ہوگی۔ اس کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ گاڑی والا سلامت ہے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا ہے۔''

''نہیں شبانہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں اسے دیکھا تھا۔ وہ سلامت نہیں رہ سکتا تھا۔ کیا تم نے وہاں کچی زمین پر وہ رنگ دیکھا ہے۔ جس رنگ کے چھینٹے تم نے میرے لباس پر دیکھے تھے۔''

''اوہ عاصم! تم بات چھپا کر بولنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر فون پر یہ بھی نہیں کہنا چاہئے۔ بہرحال میں نے وہاں کوئی آثار نہیں دیکھے۔ کوئی ایسا رنگ نہیں دیکھا۔ راستہ بالکل صاف تھا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اچھا تم قبرستان کے سامنے سے ہی گزر رہی تھیں نا؟''

''ہاں! جس راستے کا تم نے ذکر کیا تھا۔ میں اسی راستے سے گزر کر آئی ہوں۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ قبرستان کا کوئی مردہ اٹھ کر کسی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو وہ سلامت نہیں ہے۔ کسی طرح یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ وہ گاڑی اور گاڑی والا کہاں ہے۔ وہ دونوں خود اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ کوئی انہیں لے گیا ہے۔''

شبانہ نے پوچھا۔ ''کیا یہ ٹیلی فون ایکسچینج والے ہماری باتیں سن رہے ہوں گے؟''

''پتہ نہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ویسے اخلاقاً ہماری گفتگو کسی تیسرے کو سننا نہیں چاہئے''۔

''تم اخلاق کی باتیں نہ کرو۔ فون پر ہم تفصیلی گفتگو نہیں کر سکیں گے۔ میں آج رات کو کسی وقت تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گی اور اس وقت تک مزید معلومات حاصل کر لوں گی۔ تم آرام سے سونے کی کوشش کرو۔ نیند نہ آئے تو خواب آور گولیاں کھا لینا۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ اسے نیند آسانی سے نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے ہوٹل کے ملازم کو بلا کر کہا کہ اس کے لئے دو خواب آور گولیاں لے آئے۔ ملازم نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ ''سوری جناب! ہوٹل میں ایسی کوئی چیز سپلائی کرنے کی ممانعت ہے۔ جس کے ذریعے خودکشی کے اقدامات ہو سکتے ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''دو گولیوں سے خودکشی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''جناب ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے پاس پہلے سے چار چھ گولیاں موجود ہوں اور مزید آپ دو گولیاں منگوا رہے ہوں۔ ہمیں تو معاف رکھئے۔ کوئی دوسری خدمت ہو تو ہم حاضر ہیں۔''

عاصم خود ہی اپنے کمرے کو لاک کر کے ہوٹل کے باہر گیا اور ایک کیمسٹ کی دکان سے دو گولیاں خرید لیں۔ کیمسٹ بھی اعتراض کر رہا تھا لیکن اسے تھوڑی رشوت دے کر یہ کام آسان ہو گیا۔ اس دوران وہ سوچتا جا رہا تھا کہ جبران کی لاش اور اس کی گاڑی کیسے غائب ہو سکتی ہے یا انہیں کون لے جا سکتا ہے؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ جبران کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا گیا اور وہ لاش کی طرح پڑا ہو۔ بعد میں وہاں سے اٹھ کر خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا چلا گیا ہو۔ پھر یہ کہ اس کا چاقو وغیرہ بھی وہاں سے غائب تھا۔ حتیٰ کہ سڑک

پر خون کے دھبے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ شبانہ کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

وہ ہوٹل میں واپس آیا تو کاؤنٹر کے پاس ہوٹل کا منیجر اور ایک پولیس انسپکٹر کھڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر کو دیکھ کر عاصم کے ہوش اُڑ گئے۔ پہلے تو وہ گھبرایا مگر فوراً ہی سنبھل کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے وہاں سے گزرنا چاہتا تھا کہ منیجر نے اسے مخاطب کیا۔ ''مسٹر! ہمارے ملازم نے اطلاع دی ہے کہ آپ خواب آور گولیاں کھانا چاہتے ہیں کیا آپ اسی لئے باہر گئے تھے؟''

انسپکٹر اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ عاصم نے کہا۔ ''جی ہاں! میں گولیاں کھا سونا چاہتا ہوں۔''

انسپکٹر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''ذرا دکھایئے تو آپ کے پاس کتنی گولیاں ہیں اور آپ کیوں کھانا چاہتے ہیں؟''

اس نے جیب سے دونوں گولیاں نکال کر انسپکٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ ''میں کاروباری پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ اگر میں دو گولیاں کھا کر سونا چاہوں تو آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ یہ خودکشی کا عمل نہیں ہے۔''

انسپکٹر نے بڑی نرمی سے اس کی اجازت حاصل کرتے ہوئے اس کی جیب کی تلاشی لی، پھر کہا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنے سامان کی تلاشی دیں۔ اگر اس کے لئے راضی نہ ہوں تو آپ تحریری بیان دے دیں کہ اس وقت آپ صرف دو گولیاں کھا کر کمرہ نمبر تیرہ میں سونے کے لئے جا رہے ہیں۔''

اس نے تحریری بیان دے دیا۔

منیجر نے کہا۔ ''آپ کچھ خیال نہ کریں۔ ہمارے ہوٹل میں ایسی ہی ایک واردات ہو چکی ہے۔ اس لئے ہم اس سلسلے میں محتاط رہتے ہیں اب آپ آرام سکتے ہیں۔''

وہ اپنے کمرے میں آ گیا اور دو گولیاں نگلنے کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔ نیند آنے سے پہلے اس کے دماغ کی کھڑکی سے جاناں جھانک رہی تھی۔ اگر عورت کے دماغ سے اس کا آئیڈیل جھانکتا رہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ محبت میں پائیداری ہے۔ کیونکہ عورت خود کھنچی چلی آتی ہے اور اگر مرد کے دماغ سے عورت جھانکنے لگے تو پھر یہ مرد کی کمزوری ہے۔ اس کا مطلب یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ عورت دماغ سے نہیں جھانک رہی ہے بلکہ سر پر

سوار ہو گئی ہے اور ہمیشہ سوار رہے گی۔

شام کے پانچ بجے تک وہ سوتا رہا۔ پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی دروازے کو زور زور سے پیٹ رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بھی بج رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ہوٹل کا منیجر اور ملازم کھڑے ہوئے تھے۔ وہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ دروازہ کھلوانے کا کون سا طریقہ ہے؟''

منیجر نے کہا۔ ''جناب! ہم نے آپ کے سامان کی تلاشی نہیں لی تھی کہ یہاں بھی آپ نے خواب آور گولیاں رکھی ہوئی ہیں یا نہیں۔ آپ کی تحریر کے مطابق ہم نے آپ پر بھروسہ کر لیا لیکن صبح سے شام ہو چکی ہے۔ نہ آپ کمرے سے نکل رہے تھے، نہ کمرے کے اندر سے ہمیں کوئی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ ہم نے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ آپ کے کمرے کی گھنٹی بجتی رہی لیکن آپ نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ پھر ہم یہاں آ کر دروازے پر دستک دینے لگے۔ اس پر بھی آپ نے دروازہ نہیں کھولا۔ تب ہمیں مجبور ہو کر دروازے کو زور زور سے پیٹنا پڑا۔''

عاصم نے پوچھا۔ ''اب آپ کو یقین ہو گیا میں زندہ ہوں؟''

منیجر نے کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''جی خدا کا شکر ہے۔''

اس نے ملازم سے کہا۔ ''چونکہ میں زندہ ہوں اور مجھے بھوک بھی لگتی ہے۔ اس لئے ہوٹل میں جو اسپیشل ڈشیں ہوں وہ میرے لئے بھیج دو۔''

یہ کہہ کر اس نے دروازے کو بند کر لیا۔ اندر فون کی گھنٹی چیخ رہی تھی۔ اس نے آ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ہوٹل کے ایکسچینج سے کوئی بول رہا تھا۔ ''ہیلو.......... ہیلو۔''

اس نے کہا۔ ''ہیلو! کون ہے؟ کس سے بات کرنا ہے؟''

آواز آئی۔ ''کیا آپ کمرہ نمبر تیرہ کے مسٹر عاصم ہیں؟''

''جی ہاں! میں عاصم بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

''میں ہوٹل کے ایکسچینج سے بول رہا ہوں۔ بس تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ آپ بخیریت ہوں۔''

"میں بخیریت بھی ہوں اور سر سے پاؤں تک زندہ بھی۔"

اس نے جھنجلا کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر سوٹ کیس سے اپنا ایک جوڑا نکال کر باتھ روم میں چلا گیا۔ غسل وغیرہ کرنے، لباس تبدیل کر کے کھانا کھانے کے دوران وہ سوچنے لگا۔ "جبران کی لاش کہاں غائب ہوگئی۔ اس کی گاڑی کون لے گیا، خون کے دھبے کیوں نہیں تھے؟ اس کا چاقو بھی غائب تھا۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ کیا پولیس والے قتل کی اس واردات کو چھپا کر چپ چاپ قاتل تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

ایسی باتیں سوچنے کے دوران وہ بری طرح گھبرانے لگتا تھا۔ طرح طرح سے اپنے دل کو تسلیاں دیتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شبانہ بہت ہوشیار ہے۔ وہ پولیس والوں کو اپنے عاصم تک ہرگز نہیں پہنچنے دے گی۔

پھر وہ اپنے طور پر دوسرے پہلو سے سوچنے لگا۔ وہ دوسرا پہلو یہ تھا کہ جبران زندہ ہے۔ جب میں اسے قتل کر کے فرار ہوا تو میرے بھاگنے کے بعد وہ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود کسی طرح وہاں سے اٹھ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا ہوگا اور وہاں سے کہیں طبی امداد حاصل کرنے کے لئے پہنچ گیا ہوگا۔ شاید اس نے کسی ڈاکٹر کو رشوت دے کر پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے روک دیا ہو اور اس میں اس کی کوئی مصلحت ہو۔

وہ اپنی تسلی کے لئے ایسی باتیں سوچ رہا تھا۔ رات کے آٹھ بجے شبانہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے آتے ہی اسے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ کہ واقعی تم نے جبران کو قتل کیا ہے یا مجھ سے جھوٹ بول کر یہاں چلے آئے ہو؟ سوچا ہوگا کہ ایک آدھ دن کے لئے تو مجھ سے کسی طرح پیچھا چھڑا لو۔"

اس نے شبانہ کو محبت سے سمیٹ کر کہا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو؟ کیا میں نے تم سے کبھی بیزاری ظاہر کی ہے یا تم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ کیا تم نے کل رات میرے لباس پر خون کے چھینٹے نہیں دیکھے تھے؟"

"ہاں! میں نے دیکھے تھے لیکن تم ہی بتاؤ کہ وہ لاش کہاں غائب ہوگئی؟ گاڑی بھی وہاں نہیں تھی۔ وہاں تمہارا چاقو بھی نہیں تھا۔ سڑک پر خون کے دھبے بھی نہیں تھے۔ جب تم نے اس کی جسم میں چاقو پیوست کر دیا تھا اور خون بہہ رہا تھا، تو خون کہاں گیا؟"

"یہی تو میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟"

"کچھ نہیں ہے۔ ہم کچھ دنوں کے لیے پہاڑی علاقے میں چلے جائیں گے، وہاں اچھا خاصا وقت گزار دیں گے۔ اسی لئے میں اپنا سوٹ کیس لے آئی ہوں۔"

وہ شبانہ کے ساتھ پہاڑی علاقوں کی جنت میں جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ عیش و عشرت کے دن رات گزار سکتا تھا۔ اسے شبانہ سے محبت بھی تھی لیکن جاناں کے شہر میں پہنچ کر جاناں سے ملاقات نہ کرنا، اس کی صورت نہ دیکھنا یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ ہر حال میں اس سے ملنا چاہتا تھا اور اس سے ملنے کے لئے لازمی تھا کہ وہ اب شبانہ سے پیچھا چھڑائے۔

شبانہ اسے بتاتی جا رہی تھی کہ وہ کس طرح اسے پولیس اور قانون سے دور رکھے گی۔ پہاڑی علاقے میں وہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کریں گے۔ اگر انہیں ذرا بھی اس قتل کے سلسلے میں کوئی خبر ملی تو وہیں سے عاصم ملک سے باہر چلا جائے گا۔ کسی طرح سرحد پار کر لے گا۔

وہ بولتی جا رہی تھی۔ ادھر وہ سوچتا جا رہا تھا۔ آخر اس کے دماغ میں ایک تدبیر آ ہی گئی کہ شبانہ سے کس طرح پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ "میری جان! تمہارے منصوبے بہت اچھے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ ہوا تو میں اسی طرف سے سرحد پار کر جاؤں گا۔ ورنہ تمہارے ساتھ پھر واپس آ جاؤں گا۔ ارے ہاں! میرے سگریٹ ختم ہوگئے ہیں۔ تم یہاں بیٹھو میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

"باہر جانے کیا ضرورت ہے۔ ملازم سے منگوا لو۔"

"یہاں کے ملازم بہت غیر ذمہ دار ہیں۔ دو بار، چار بار گھنٹی بجا کر بلاؤ تو ایک بار آتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں خود ہی جا کر لے آؤں۔ بس ابھی جاتا ہوں اور ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر ہوگیا۔ پھر ہوٹل سے نکل گیا۔ سگریٹ اور پان کی دکان وہاں قریب ہی تھی لیکن وہ ذرا دور ایک ٹیلی فون بوتھ کے اندر گیا۔ پھر وہاں ہوٹل ڈیلا ئیلا سے رابطہ قائم کیا۔ ایکسچینج والوں کو بتایا کہ وہ کمرہ نمبر تیرہ کے مسٹر عاصم سے بات کرنا چاہتا ہے۔

اسے ذرا انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد اسے شبانہ کی آواز

سنائی دی۔ ''ہیلو! میں کمرہ نمبر تیرہ سے بول رہی ہوں۔ مسٹر عاصم تو نہیں ہیں لیکن میں ان کی وائف ہوں۔ آپ کون ہیں اور کس سلسلے میں میرے شوہر سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں؟''

وہ آواز بدل کر بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''اپنے شوہر سے بولو کہ کمرے میں چھپ کر تمہیں فون اٹینڈ کرنے کے لئے نہ کہے۔ وہ قانون سے چھپ سکتا ہے لیکن ہم سے نہیں چھپ سکتا۔ جبران کا مردہ جسم ہمارے پاس ہے اور ایسے ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں جو تمہارے شوہر کو پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتے ہیں۔''

دوسری طرف سے شبانہ کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''آ.......... آپ کون ہیں؟ آپ میرے شوہر سے کیا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے تو مجھ سے بات کریں۔ میں اور میرا شوہر آپ سے ملنا پسند کریں گے۔''

''مگر میں تم سے ملنا پسند نہیں کروں گا۔ میرا معاملہ تمہارے شوہر سے ہے۔ اس سے کہو کہ وہ چپ چاپ، تنہا احمد نگر پہنچ جائے۔ میں موقع دیکھ کر اس سے بات کروں گا اور..........''

اس نے اور کہہ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ شبانہ کو اور زیادہ گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔ وہ بولی۔ ''اور کیا۔ آپ مجھ سے کھل کر بات کریں۔''

''میں نے کہا نا کہ تم سے نہیں، مجھے تمہارے شوہر سے گفتگو کرنی ہے لہٰذا جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔ اگر وہ کل تک احمد نگر نہیں پہنچا تو میں اسے عدالت تک پہنچا دوں گا۔''

یہ کہتے ہی اس نے ریسیور کو ہک سے لٹکا دیا اور بوتھ سے باہر نکل آیا۔ اب وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ یقیناً اب شبانہ یہی فیصلہ کرے گی کہ اسے جلد از جلد احمد نگر کے لئے روانہ ہو جانا چاہئے اور وہ ابھی ایک آدھ گھنٹے کے بعد شبانہ کے سامنے احمد نگر جانے والی بس میں سوار ہو جائے گا پھر اس شہر سے باہر پہنچتے ہی بس سے اتر کر واپس آئے گا اور کسی دوسرے ہوٹل میں قیام کرے گا۔ شبانہ اس وقت تک واپس جا چکی ہوگی۔ پھر وہ دوسری صبح جاناں سے بھی ملاقات کرنے جائے گا۔

اس کی پلاننگ حسب حالات تھی۔ شبانہ نے موجودہ حالات کے مطابق یقین کر لیا کہ یقیناً کوئی عاصم کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے اور بلیک میل کرنے والا وہی ہوگا جس نے

جبران کی لاش کو اور اس کی گاڑی کو غائب کیا ہے اور یقیناً وہ عاصم کے خلاف کچھ ثبوت رکھتا ہوگا۔

جب عاصم ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو شبانہ نے یہی باتیں چھیڑیں دونوں بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ عاصم کو اسی وقت احمد نگر کے لیے روانہ ہو جانا چاہئے۔ وہ کل دن کے دس بجے تک وہاں پہنچ جائے گا۔ شاید کل ہی وہ بلیک میلر عاصم سے رابطہ قائم کرے اور اس طرح شاید کوئی ایسی بات بن جائے کہ اس قتل کے الزام سے ہمیشہ کے لئے عاصم کو نجات مل جائے۔ خواہ اس کے لئے بلیک میلر کو اس کی منہ مانگی رقم ادا کرنی پڑے۔

رات کے گیارہ بجے شبانہ اسے لاری اڈے تک پہنچانے آئی۔ عاصم اس کے سامنے ایک بس میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پھر شہداد پور کے ایک مضافاتی علاقے میں وہ بس سے اتر گیا۔ وہاں سے وہ دوسری بس میں سوار ہو کر واپس آیا۔ ایک متوسط طبقے کے ہوٹل دلشاد میں ایک کمرہ حاصل کیا۔ پھر ایک ٹیلی فون بوتھ پر پہنچ کر ہوٹل ڈیلا ئیلا سے رابطہ قائم کیا رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''میں آپ کے ہوٹل کے کمرہ نمبر تیرہ کے مسٹر عاصم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

جواب ملا۔ ''سوری! تھوڑی دیر پہلے وہ کمرہ خالی ہو چکا ہے۔ مسٹر عاصم جا چکے ہیں۔''

عاصم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ کمرہ خالی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ شبانہ وہ ہوٹل چھوڑ کر اس شہر سے جا چکی ہے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور بوتھ سے باہر آ گیا۔ کچھ لوگ اپنے طور پر چالیں چلنے کے دوران بڑے مطمئن رہتے ہیں۔ انہیں کسی کی گرفت میں آنے کا خدشہ نہیں رہتا لیکن تقدیر چھپ چھپ کر ان کا تماشہ دیکھتی رہتی ہے۔ اس وقت وہ اندھیرے میں چھپی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔

جب وہ بوتھ سے نکل کر ایک طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگا تو وہ بھی کچھ فاصلہ رکھ کے اس کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔ رات کا سناٹا تھا۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ ویران تھے۔ عاصم نے اپنے پیچھے کھٹ کھٹ کی آواز سنی جیسے کوئی اونچی ایڑی کے سینڈل پہن کر پیچھے پیچھے آ رہی ہو۔ اس نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا۔ ذرا فاصلے پر کوئی عورت تھی جو نیم تاریکی میں واضح

طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ ذرا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس نے سوچا پیچھے آنے والی عورت تنہا ہے۔ کوئی بدمعاش اسے پریشان نہ کرے۔ وہ کم از کم ہوٹل تک تو اس کا ساتھ دے سکتا ہے۔ عاصم کی رفتار سست رہی۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اس کے برابر آ گئی۔

تب عاصم نے اسے دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ مسکراتے ہوئے بول رہی تھی۔ ''ہیلو! میں نائٹ ڈیوٹی سے آ رہی ہوں اور اب اپنے گھر جا رہی ہوں۔ کیا تم بھی کہیں ملازمت کرتے ہو؟''

''جی نہیں! میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ کچھ روز کے لئے آیا ہوں اور یہاں ہوٹل دلشاد میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''اچھا! میں اس ہوٹل کے پیچھے ہی ایک محلے میں رہتی ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ کسی طرح کی معلومات حاصل کرنی ہوں یا شہر میں گھومنا پھرنا ہو تو کل صبح میں اپنے بیٹے کو تمہارے پاس بھیج دوں گی۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اگر مجھے ضرورت ہوئی تو ضرور آپ سے رابطہ قائم کروں گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''کیسے رابطہ قائم کرو گے؟ میرا پتہ تو تم جانتے نہیں ہو۔ چلو، یہی بتا دو کہ ہوٹل کے کس کمرے میں قیام ہے!''

''کمرہ نمبر چار میں۔''

ہوٹل کے سامنے پہنچ کر عاصم نے کہا۔ ''اگر آپ کہیں تو میں گھر تک پہنچا دوں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''نہیں! میرے پاس نہ تو دولت ہے نہ جوانی۔ کوئی کیا لوٹے گا؟ میں روز رات کو بحفاظت آتی جاتی ہوں۔ تمہارا شکریہ!''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ عاصم ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ وہاں کا ایک ملازم ٹیلی فون کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کی آہٹ سن کر چونک گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کی بورڈ کے پاس گیا اور چار نمبر کی چابی نکال کر عاصم کی طرف بڑھا دی۔ عاصم نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''تمہاری یادداشت بڑی اچھی ہے۔ میرا چہرہ دیکھتے ہی پہچان لیا کہ میں کمرہ نمبر چار کا مسافر ہوں۔''

''جناب! چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ گنتی کے مسافر آتے ہیں۔ پہچاننا کیا دشوار ہے؟ مجھے تو آپ کا نام بھی معلوم ہے۔ آپ عاصم صاحب ہیں نا؟''

وہ ہاں کہہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ بیس منٹ کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے سونے جا رہا تھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہی کاؤنٹر کلرک سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''عاصم صاحب! آپ کا فون ہے۔ پتہ نہیں کون صاحب ہیں۔ انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بس اتنا ہی کہا کہ میں آپ کو اطلاع دے دوں۔ آپ ضرور فون ریسیو کریں گے۔''

عاصم نے کچھ سوچا مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی رات کو کون اسے فون کر سکتا ہے۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ بہر حال وہ کمرے سے نکل کر کاؤنٹر کے پاس آیا۔ ریسیور کریڈل سے الگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو۔''

دوسری طرف سے ایک تیز اور چبھتی ہوئی سی سرگوشی سنائی دی۔ ''مسٹر عاصم! آپ اسے سرِ راہ چھوڑ آئے۔ ہمیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی آخری رسوم کون ادا کرے گا؟ اور کس طرح ادا کرے گا؟''

عاصم نے حیرانی سے دیدے پھیلا کر اس سرگوشی کو سنا۔ اس کا دل اچانک ہی دھڑکنے لگا تھا۔ خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ کس کے متعلق پوچھ رہے ہو؟ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔''

پھر وہی سرگوشی سنائی دی۔ ''سب کچھ سمجھ لو گے۔ جبران کو نیا سفید لباس اور دو گز زمین چاہئے۔ کیا تم اسے فراہم نہیں کرو گے؟''

اب عاصم بری طرح گھبرا رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے کاؤنٹر کیپر کو دیکھا۔ وہ ذرا دور بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں! مگر آپ کون ہیں؟ مجھے کچھ معلوم تو ہونا چاہئے۔''

دوسری طرف سے سرگوشی میں کہا گیا۔ ''یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ اپنا سامان لے کر ہوٹل سے نکل آؤ اور فٹ پاتھ پر چلتے رہو۔ کہیں نہ کہیں تمہیں یہ بتا دیا جائے گا کہ تمہاری منزل کہاں ہے اور ہم سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

آواز بند ہو گئی۔ عاصم نے اسے مخاطب کیا۔ ''ہیلو سنئے ہیلو!''

مگر دوسری طرف کوئی سننے والا نہیں تھا۔ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ کاؤنٹر کیپر نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے جناب! آپ کچھ پریشان ہو گئے ہیں؟''

وہ جلدی سے جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرے گھر سے فون آیا ہے کہ مجھے شہداد پور سے فوراً ہی واپس جانا چاہئے۔ میری وائف کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں اسی وقت ہوٹل چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کرایہ تو پیشگی دے چکا ہوں اور کوئی بات ہو تو بتا دو۔''

کاؤنٹر کیپر نے کہا۔ ''اور کوئی بات نہیں ہے جناب! بل ادا ہو چکا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ میں آپ کی وائف کے لئے دعا کرتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ اپنا سوٹ کیس لے کر ہوٹل سے باہر آ گیا اور فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ وہی ویرانی اور خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے سارا شہر سو رہا ہے۔ وہ چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ کس فٹ پاتھ سے گزرتا رہے۔ اس بات کی ہدایت نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے وہ فٹ پاتھ جتنی دور تک جاتا تھا وہ بھی اس پر چلتا رہا۔

بہت دور چلنے کے بعد کوئی سامنے نظر آیا۔ نیم تاریکی میں وہ اسے اتنا پہچان سکا کہ کوئی عورت کھڑی ہوئی ہے۔ جب قریب پہنچا تو وہی نائٹ ڈیوٹی سے آنے والی عورت نظر آئی۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''ہیلو مسٹر عاصم! تم ابھی تک بھٹک رہے ہو؟''

عاصم نے چونک کر پوچھا۔ ''آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

اس نے مسکرا کر ایک کاغذ کی پرچی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے وہ پرچی کھول کر پڑھی۔ اس میں لکھا تھا۔ ''اس خاتون کے ساتھ جاؤ۔''

بس اتنا ہی لکھا تھا۔ عاصم نے سر اٹھا کر دیکھا وہ پلٹ کر جا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ مگر اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''آخر مجھے کہاں لے جاؤ گی تم کون ہو؟ کیا اس ٹیلی فون والی گفتگو سے باخبر ہو؟''

وہ خاموشی سے چلتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ خاتون نے دروازہ کھولا۔ پھر اسے اشارے سے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کمرے میں پہنچا، کمرے کی سجاوٹ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ

چھوٹا سا ڈرائنگ روم ہے۔ صوفوں کے درمیان ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ میز پر ایک کیسٹ ریکارڈر بھی تھا۔ خاتون نے کہا۔ ''میں اب جا کر سو رہی ہوں مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ اس کیسٹ ریکارڈر میں تمہارے لیے پیغام ہے۔ اسے بیٹھ کر سن لو اور اس کے بعد عمل کرو۔''

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف گئی۔ پھر اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ''جب یہاں سے جانے لگو تو اس باہر والے دروازے کو بند کر دینا۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ اب بستر سے نہیں اٹھوں گی تمہارا شکریہ۔''

وہ کمرے کے اندر گئی اور دروازے کو بند کر لیا۔ عاصم تنہا رہ گیا۔ وہ کبھی بند دروازے کو اور کبھی اس کیسٹ ریکارڈر کو دیکھ رہا تھا پھر وہ سوٹ کیس کو فرش پر رکھ کر ریکارڈر کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے ریکارڈر کو ہاتھ لگانے کے خیال سے ڈر لگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی ٹائم بم ہو اور ابھی ایک دھماکے سے پھٹ پڑے گا مگر حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ اسے جبران کے حوالے سے یہاں آنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

اس نے کیسٹ ریکارڈر کو اپنے قریب میز پر کھسکا لیا۔ پھر اس کے بٹن کو آن کر دیا۔ چند ساعتوں تک خاموشی رہی۔ پھر آواز ابھرنے لگی۔ ''مسٹر عاصم، تمہاری آمد کا شکریہ۔ ہمیں امید ہے کہ تم اسی طرح ہمارے احکامات کی تعمیل کرتے رہو گے۔ جلد ہی ہم سے ملاقات ہو جائے گی لیکن ملاقات سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنی اور جبران کی کچھ آوازیں سن لو۔ یہ آوازیں اس وقت ریکارڈ کی گئیں تھیں جس وقت تم دونوں قبرستان کے سامنے آپس میں گتھم گتھا تھے۔ یہ آواز جو تم سنو گے وہ اصل نہیں بلکہ ری ریکارڈنگ ہے۔ اس لیے آواز کی کوالٹی صحیح نہیں ہے۔ پھر بھی تم اپنی اور جبران کی آواز کو اچھی طرح پہچان سکو گے تو پہلے آواز سنو اس کے بعد ہم اسی کیسٹ میں دوبارہ تم سے مخاطب ہوں گے تو لو۔ یہ رہی تمہاری آواز۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر آواز ابھرنے لگی۔ کہیں دور گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عاصم کو یاد آیا کہ قبرستان کے پاس اس وقت دو چار گیدڑ چلا رہے تھے۔ اس کے سوچنے کے دوران کیسٹ سے گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر اسے اپنے اور جبران کے ابتدائی مکالمے سنائی دیئے۔ جبران کا چیلنج بھی سنائی دیا کہ وہ عاصم کی تلاش میں ہی وہاں آیا ہے۔ پھر وہ آوازیں بھی سنائی دیں جب

وہ ایک دوسرے سے ٹکرانے لئے تھے۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنے جا رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں اور آج ان میں سے کسی ایک کی لاش گرے گی اور کوئی زندہ سلامت اپنی بیوی کے پاس پہنچے گا اور محبوبہ کو بھی حاصل کرے گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جبران کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ عاصم سمجھ گیا کہ اس وقت تک اس کا چاقو جبران کے جسم میں پیوست ہو چکا تھا۔ پھر کیسٹ میں خاموشی رہی۔ کچھ دھیمی دھیمی سی آواز، اِدھر اُدھر جانے والے قدموں کی تھی۔ اس کے بعد ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ عاصم تصور میں وہ منظر دیکھ رہا تھا کہ وہ پہلی ہی گولی کی آواز پر کس طرح بھاگنے لگا تھا۔ اس کے بعد دوسری گولی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ پھر کیسٹ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

وہ کیسٹ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس نے جبران کو قتل کیا ہے اس وقت اس کا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے اس کی دھڑکنیں حلق تک پہنچ رہی ہوں۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں بھاگ کر چھپ جائے اور قانون کی باتیں اور اس بلیک میلر کی کوششیں اسے تلاش نہ کر سکیں۔

کیسٹ سے پھر آواز ابھرنے لگی۔ ''مسٹر عاصم، تم نے اپنی اور جبران کی جنگ وجدل والی گفتگو سن لی ہوگی۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ تم دونوں کسی ایک کو ختم کر کے اپنی اپنی محبوبہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ جبران تم پر غالب نہ آ سکا۔ تم نے اسے قتل کر دیا۔ اب جبران کا وہ انٹرویو سنو جو اس نے دم توڑنے سے پہلے ریکارڈ کرایا تھا۔''

دوسرے ہی لمحے جبران کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی پوچھ رہا تھا۔ ''مسٹر، تمہارا نام کیا ہے؟''

جبران نے کراہتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ پھر اس آدمی نے کہا۔ ''دیکھو ہم ابھی تمہیں فوری طبی امداد پہنچائیں گے۔ تمہیں بچانے کی کوشش کریں گے لیکن جس نے تمہیں چاقو گھونپ کر قتل کرنے کی کوشش کی ہے اس کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام عاصم ہے۔ وہ مشہور فلمسٹار شبانہ کا شوہر ہے۔''

''تم دونوں میں دشمنی کیا ہے؟''

''میری بیوی پر اس کی نیت خراب ہے۔''

''کس کی نیت خراب ہے؟ نام لے کر بولو۔''

''عاصم میری بیوی پر بری نظر رکھتا ہے۔''

''ہم نے سنا ہے کہ جب تم فلم ڈائرکٹر تھے تو شبانہ سے محبت کرتے تھے اور اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن شبانہ نے تمہیں لفٹ نہیں دی اور عاصم سے شادی کر لی۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم بھی شبانہ پر بری نظر ڈالتے ہو؟''

وہ کراہنے لگا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔ ''وقت ضائع نہ کرو میرے سوال کا جواب دو۔ ہم تمہیں فوراً طبی امداد پہنچانا چاہتے ہیں۔''

وہ کراہتے ہوئے اور ایک آہ بھرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جس طرح میں عاصم کا رقیب ہوں اسی طرح عاصم میرا رقیب ہے۔ ہم اپنی محبت کی دیوانگی سے مجبور ہیں ایک دوسرے کو اپنی محبوبہ کے پاس برداشت نہیں کر سکتے۔ افسوس زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے جاناں جیسی حسین اور دولت مند بیوی ملی لیکن عشق کی دیوانگی نے مجھے اس کی طرف مائل نہیں کیا۔ میرا دل شبانہ کی طرف لگا رہا۔ یہی حال عاصم کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ شبانہ بھی انتہائی خوبصورت ہے۔ دولت مند بھی ہے۔ بہت زیادہ شہرت رکھنے والی فلمسٹار ہے پھر بھی وہ میری بیوی کی طرف مائل رہتا ہے۔ یہ بار بار بجلی کیوں چمک رہی ہے۔''

''یہ فلش لائٹ ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ مختلف زاویوں سے تمہاری تصویریں اتاری جا رہی ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے آواز بند ہوئی۔ دوسرے لمحے آواز پھر ابھرنے لگی۔ عاصم کو مخاطب کر کے کہا جا رہا تھا۔ ''تم نے جبران کا دم توڑتا ہوا انٹرویو سن لیا۔ اس انٹرویو کے ذریعے.........''

عاصم نے بے اختیار پوچھا۔ ''کیا جبران مر چکا ہے؟''

پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ کیسٹ ریکارڈر سے یہ سوال کر رہا تھا۔ جس کا جواب نہیں مل سکتا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر پر آواز بدستور جاری تھی۔ ''تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ جبران کی تصویریں بھی مختلف زاویوں سے اتاری گئی ہیں اور ہاں، تمہارا وہ چاقو بھی

ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یقیناً اس کے دستے پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ نہ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا تمہارے لئے پھانسی کا پھندا نہ سہی، عمر قید کی سزا تو رکھی ہوئی ہے۔ کیا خیال ہے۔ قانون کی گرفت میں جانا چاہتے ہو یا ہمارے اشاروں پر چلنا منظور ہے۔ اگر منظور ہے تو یہاں سے اٹھو۔ باہر جاؤ۔ سامنے گلی میں ایک گاڑی کھڑی ہوئی ہے اس کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاؤ۔ پھر وہ گاڑی تمہیں ہمارے پاس پہنچادے گی۔''

آواز بند ہوگئی۔ وہ انتظار کرنے لگا کیسٹ چل رہا تھا لیکن آواز نہیں ابھر رہی تھی۔

پھر اس نے ریکارڈر کو آف کردیا۔ وہاں سے اٹھ کر اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں وہ عورت سونے کے لیے گئی تھی۔ اس کے دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کون لوگ اسے ٹریپ کررہے ہیں اور وہ عورت کون ہے۔ اگر اسے بہلایا یا پھسلایا جائے یا اسے قتل کرنے کی دھمکی دی جائے تو شاید وہ ٹریپ کرنے والوں کی نشاندہی کرسکے اور اسے ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ بتاسکے۔

یہ سوچ کر وہ دروازے کے پاس گیا۔ اس عورت نے کہا تھا کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ وہ سونے جارہی ہے لیکن اس نے دروازے پر دستک دی۔ دستک کے ہلکے سے دباؤ سے وہ دوروازہ ذرا سا کھل گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ عاصم نے اسے پوری طرح کھول دیا۔

وہ بیڈروم خالی نظر آرہا تھا۔ بستر پر وہ نہیں تھی۔ شاید باتھ روم میں ہوگی۔ اس نے باتھ روم کے دروازے کے قریب پہنچ کر آواز دیں۔''میں میرا مطلب ہے محترمہ آپ موجود ہیں۔''

اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازے کو ہولے سے چھو کر دیکھا تو وہ بھی ذرا سا کھل گیا۔ اس نے دروازے کو پوری طرح کھول دیا باتھ روم خالی تھا۔ وہ عورت نہیں تھی۔ اس نے پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ دوسری طرف ایک اور بند دروزاہ نظر آیا تھا۔ یقیناً وہ دروازہ پچھلی گلی کی طرف کھلتا ہوگا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اس دروازے کے پاس پہنچ گیا۔

اس دروازے پر ایک چھوٹا سا کاغذ چپکا ہوا تھا اور اس پر لکھا ہوا تھا مسٹر وہ گاڑی سامنے گلی کی طرف ہے۔ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔

یہ پڑھنے کے باوجود اس نے دروازے کو کھولنا چاہا۔ پتہ چلا کہ وہ باہر سے بند ہے۔

وہ جانے والی پہلے اس کاغذ پر یہ تحریر لکھ کر اور دروازے پر چپکا کر اسے باہر سے بند کرکے چلی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کیسٹ ریکارڈر کی تمام گفتگو کو پہلے سن چکی تھی اور یہ جانتی تھی کہ عاصم کو ہر حال میں سامنے گلی کی طرف جاکر گاڑی میں بیٹھنا ہے۔ اسی لئے وہ پچھلا دروازہ بند کرکے چلی گئی تھی۔

وہ سر جھکا کر وہاں سے چلتا ہوا پہلے کمرے میں آیا۔ وہاں فرش پر اس کا سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کو اٹھالیا۔ پھر سامنے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا۔ اس دروازے کے باہر وہ گلی تھی اور کمرے کے اندر سے ہی گلی میں کھڑی ہوئی گاڑی نظر آرہی تھی۔ وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے چلتا ہوا اس گاڑی کے قریب پہنچا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے لیکن بھاگ کر کہاں جاسکتا تھا۔ اس کی کمزوری کسی بلیک میلر کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ ساری زندگی اپنے پُراسرار دشمن سے چھپ کر نہیں گزار سکتا تھا۔

گاڑی کے ڈرائیور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ گاڑی کے اگلے حصے کی طرف آیا۔ ڈرائیور نے کہا۔''نہیں مسٹر پچھلے حصے کی طرف جائیں۔''

وہ پچھلے حصے میں آکر بیٹھ گیا۔ ادھر کے دروازے کو ایک شخص نے بند کردیا۔ اب وہ پچھلا حصہ چاروں طرف سے بند تھا۔ وہاں کوئی چھوٹی سی کھڑکی یا روشندان بھی نہیں تھا کہ جہاں سے وہ جھانک کر باہر کی طرف دیکھ سکتا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچا۔ یہ کیا ہورہا ہے، اس نے شبانہ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنی بیوی کو اس شہر سے رخصت کرنے کے لیے ایک چال چلی تھی۔ خود ہی بلیک میلر بن کر شبانہ پر یہ ظاہر کیا تھا کہ کوئی اس کے جرم کو جانتا ہے اور ثبوت کے ساتھ جانتا ہے لہٰذا وہ شبانہ کے ساتھ کسی پہاڑی علاقے کی طرف نہیں جاسکے گا۔ اسے احمد نگر جانا چاہئے۔ بے چاری شبانہ اس کے قریب آکر اس شہر سے واپس چلی گئی تھی لیکن تقدیر نے اسے سچ مچ کسی بلیک میلر کے حوالے کردیا تھا۔

وہ سوچتا رہا۔ گاڑی چلتی رہی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اسے تھکن محسوس ہورہی تھی۔ پچھلی رات سے وہ بھاگتا جارہا تھا۔ کبھی اس شہر سے اس شہر کبھی اس ہوٹل سے اس ہوٹل۔ کبھی شبانہ کو دھوکہ دینے کے لیے چالیں چل رہا تھا اور کبھی خود بلیک میلر کی چالوں میں آرہا تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ تھکن سے مجبور ہو کر سیٹ پر لیٹ گیا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ گاڑی اسے کہاں لے جا رہی ہے۔ اس وقت تو وہ کسی ڈبے کے اندر بند تھا۔ وہاں ایک سوراخ بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ باہر جھانک کر دیکھ سکتا۔ یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات ابھی باقی ہے یا صبح کا اجالا پھیل رہا ہے۔ اس قید خانے کی تاریکی میں اس کی رسٹ واچ کے ہندسے چمک رہے تھے گھڑی پانچ بجا رہی تھی۔

دہشت، پریشانی، بے چینی اور تجسس کے مارے وہ سو نہیں سکتا تھا۔ وہاں لیٹے ہی لیٹے انتظار کر رہا تھا کہ گاڑی اب تب میں کسی منزل پر رکے گی لیکن وہ چلی ہی جا رہی تھی۔ دو گھنٹے اور گزر گئے۔ پھر وہ گاڑی کہیں رک گئی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انتظار کرنے لگا کہ دروازہ کھلے گا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ دس منٹ کے بعد گاڑی پھر آگے بڑھ گئی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ شاید کسی پٹرول پمپ کے پاس رکی تھی اور پٹرول بھرنے کے بعد پھر آگے چل پڑی ہے۔ وہ پھر مایوس ہو کر لیٹ گیا۔ اب اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں وہ نیند سے لڑ رہا تھا تھکن اسے تھپک رہی تھی۔ خوف اسے کچوکے لگا رہا تھا لیکن کہتے ہیں کہ نیند کو اگر آنا ہوتا ہے تو وہ کانٹوں کے بستر پر بھی آ جاتی ہے سو آ گئی اور وہ سو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو پہلے اسے پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہے۔ کس ماحول میں ہے اور وہ کتنی دیر تک سوتے رہنے کے بعد بیدار ہوا ہے۔ جب اسے یاد آیا کہ وہ ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں سفر کر رہا تھا تو اچانک ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ گاڑی رکی ہوئی تھی اور اس کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا سوٹ کیس سامنے رکھا ہوا تھا۔

وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر گاڑی سے باہر آ گیا۔ گاڑی کا ڈرائیور نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچی پختہ دیواریں تھیں۔ ایک طرف بڑا سا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ وہ آگے بڑھ کر اس دروازے سے گزر کر دیکھنے لگا۔ ایک کشادہ کوریڈور دور تک چلا گیا تھا۔ دائیں بائیں بھی اس کوریڈور سے مختلف راستے نکلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھنے لگا ایک کوریڈور میں مڑ کر دیکھا تو وہاں کچھ لوگ آتے جاتے ہوئے نظر آئے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی عمارت کے اندر پہنچ گیا اور جو لوگ نظر آ رہے تھے ان میں کسی ہاتھ میں بڑا سا فائل تھا۔ کوئی ڈاکٹروں جیسا ایپرن پہنے ہوئے تھا۔ کوئی اپنے چہرے سے یا حلیے سے پروفیسر یا سائنسدان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک گزرنے والے شخص کو

مخاطب کیا۔ ''مسٹر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

جانے والے نے اسے ایک نظر دیکھا۔ پھر اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایک عورت ادھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے مخاطب کیا۔ ''میڈم پلیز، مجھے یہ بتا دیجئے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

وہ ایک خودکار زینے کی طرف جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رک گئی پھر اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ جب عاصم اس کے قریب پہنچا تو عورت نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور خودکار زینے پر چڑھ گئی۔ اب وہ اس کے ساتھ اوپر کی طرف جا رہا تھا، اوپر پہنچ کر اس نے کہا۔ ''میڈم، میں بھٹکتا ہوا یہاں پہنچ گیا ہوں کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''یہ ہماری تنظیم کا ہیڈ کوارٹر ہے۔''

کون سے تنظیم؟''

''تنظیم تبدیلئ حیات۔''

عاصم نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری اردو کچھ کمزور ہے۔ تنظیم تبدیلئ حیات کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔ مسٹر یہ وہ ادارہ ہے جہاں کسی بھی چیز کی زندگی کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔''

''میڈم یہی بات تو سمجھ میں نہیں آئی کہ زندگی کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔''

''ایسے کہ ابھی تم اپنے اصلی روپ میں ہو اور اپنی زندگی پیدائش کے وقت سے گزار رہے ہو لیکن ہم تمہیں اس طرح تبدیل کر دیں گے کہ تمہارا چہرہ، تمہاری شخصیت بدل جائے گی، تمہارا نام بدل جائے گا، تمہاری آواز بدل جائے گی۔ تمہارے طور طریقے بدل جائیں گے۔ تمہارا مزاج بھی بدل جائے گا۔ تمہاری پسند اور ناپسند میں بھی تبدیلیاں آ جائیں گی۔ جب یہ سب کچھ بدل جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تمہاری زندگی بھی بدل چکی ہے اور تم اپنی پیدائشی زندگی کو چھوڑ کر کوئی دوسری زندگی گزار رہے ہو۔ اس طرح زندگی تبدیل ہوتی ہے یا نہیں؟''

وہ باتوں کے دوران ایک لفٹ میں داخل ہو گئے۔ وہ لفٹ اوپر جانے لگی۔ عاصم نے کہا۔ ''ہاں اس طرح تو واقعی زندگی بدل جاتی ہے لیکن میں نے ایسے ادارے کا نام پہلے

کبھی نہیں سنا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔''کوئی بھی شریف آدمی ایسے ادارے کا نام سن ہی نہیں سکتا۔ یہ تو صرف مجرموں کے لیے ہے جو قانون سے چھپنا چاہتے ہیں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔''اسی لیے مجھے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ تمہارا باس یا اس ادارے کا مالک کون ہے؟''

''میں تمہیں ابھی وہیں پہنچا رہی ہوں۔''

لفٹ رک گئی، وہ دونوں باہر آئے۔ پھر آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک کوریڈور سے گزر کر بڑے سے ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں دور دور تک میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ سر جھکائے کام کر رہے تھے۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے عاصم کو دیکھتے ہی انٹرکام کے ایک بٹن کو آن کیا۔ پھر کہا۔''جناب مسٹر عاصم حاضر ہیں۔''

آواز۔''اندر بھیج دو۔''

لڑکی نے سر اٹھا کر عاصم کی طرف دیکھا۔ پھر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔''آپ اس دروازے کو کھول کر اندر چلے جائیں اور اپنا سوٹ کیس یہاں چھوڑ دیں۔''

اس نے سوٹ کیس کو وہیں فرش پر رکھ دیا۔ پھر اس دروازے کے پاس پہنچ کر اسے کھولتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہ ایک بہت بڑا دفتری کمرہ تھا۔ فرش پر بہت ہی قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں دوسرے سامان بھی بہت ہی قیمتی تھے۔ ایک بہت بڑی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''ہیلو مسٹر عاصم، چلے آؤ۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔''

وہ ملائم قالین پر چلتا ہوا میز کے قریب پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔''کیا جبران مر چکا ہے؟''

ریوالونگ چیئر پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔''قتل تم نے کیا اور پوچھتے ہم سے ہو؟''

''میں اس کی لاش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''تم نے دو راتیں پہلے اسے اپنے شہر میں قتل کیا۔ وہاں سے بھاگ کر شہداد پور آئے

شہداد پور سے ایک گاڑی میں بیٹھ کر یہاں پہنچے۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ تمہارے فرشتے بھی نہیں جان سکتے لیکن تم اپنے شہر سے تقریباً آٹھ سو میل کے فاصلے پر ہو کیا تم سمجھتے کہ ہم جبران کی لاش تمہارے پیچھے پیچھے لیے پھرتے تاکہ تمہیں دکھا سکیں۔ احمقانہ باتیں نہ کرو۔ اپنی خیریت کی بات شروع کرو۔ کیا تم قانون کی نظروں سے چھپ کر رہنا چاہتے ہو؟''

عاصم نے کہا۔''آپ لوگوں کے پاس میرے خلاف ثبوت ہے اگر وہ ثبوت ضائع ہو جائے تو مجھے چھپنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''وہ ثبوت ضائع نہیں ہوں گے۔ ہمارے ریکارڈ میں رہیں گے۔ ہم تمہارے ساتھ اتنی مہربانی کر سکتے ہیں کہ تمہیں قانون کی نظروں سے چھپا دیں''

''کیا سیرت اور شخصیت بدل کر چھپائیں گے؟''

ہاں، یہ بات تمہیں بتا دی گئی ہوگی کہ یہ تنظیم تبدیلیٔ حیات ہے میں یہاں کا مالک ہوں۔''

کیا آپ میک اپ کے ذریعے صورت بدلتے ہیں؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔''میک اپ کے ذریعے عارضی طور پر صورت بدلی جا سکتی ہے۔ میں پلاسٹک سرجری کا ماہر ہوں ہمیشہ کے لیے صورت بدل دیتا ہوں۔ پھر یہ کہ میرے ہاں ماہر نفسیات ہیں، ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں۔ آواز کی، تحریر کی شناخت کے ماہر اور اندازِ گفتگو کا تجربہ کرنے والے موجود ہیں۔ میں تمہاری صورت بدلوں گا۔ میرے ماہرین تمہاری شخصیت بدل کر رکھ دیں گے۔ حتیٰ کہ بیوی جو خلوت میں اور جلوت میں تمہاری ساتھی رہتی ہے۔ وہ بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی۔''

''ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ کے پاس میرے خلاف ثبوت ہے۔ میں وہ ثبوت ضائع کرنے کے سلسلے میں معقول رقم ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

نہیں، ہمارا طریقۂ کار یہ نہیں ہے۔ ہم تم سے زیادہ سے زیادہ کتنی رقم لے سکتے ہیں۔ تم کتنی رقم دے سکتے ہو؟''

''میں آپ کو اس سلسلے میں ایک لاکھ روپے دوں گا۔''

''اور میں تمہاری صورت اور شخصیت بدل کر ایک کروڑ کی جائداد کا مالک بنا دوں گا۔ تم سے رقم لینے کی بجائے تمہیں اتنا دولت مند بنا دوں گا کہ تم نے خواب میں بھی اتنی

دولت نہیں دیکھی ہوگی۔''

عاصم نے حیران سے پوچھا۔''وہ کیسے؟''

وہ ریوالونگ چیئر پر ادھر سے اُدھر گھوم کر بولا۔''ہمارے پاس کروڑ پتی اور ارب پتی سرمایہ داروں کی فہرست ہے۔ ان کی تصاویر اور ان کی پوری ہسٹری شیٹ ہے۔ ہم ان میں سے کسی سرمایہ دار کو غائب کر کے اس کی جگہ تمہیں پہنچا دیں گے۔ ان کے عزیز اور رشتہ دار تمہیں دیکھ کر کبھی شبہ تک نہیں کریں گے کہ تم مسٹر عاصم ہو۔ تم ہو بہو وہی آدمی ہو گے۔ وہی شخصیت ہوگی، وہی مزاج ہوگا۔ وہی گفتگو کا انداز ہوگا۔ تم اس کی طرح لکھنا سیکھ جاؤ گے۔ اس کی طرح دستخط کرو گے۔ ایسی تبدیلی تمہارے لیے بہتر ہوگی۔ تم شبانہ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو جیسا کہ بعض مرد اپنی بیویوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں اور تمہاری خواہش ہے کہ تمہیں کشور جاناں مل جائے تو ہم تمہیں جبران بنا کر جاناں کے پاس بھیج دیں گے۔''

وہ ایک دم سے کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بڑے شوق سے اس نے سوال کیا۔''کیا ایسا ممکن ہے کیا میں جبران بن کر جاناں کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔''

''پلاسٹک سرجری کے ذریعے ایسا ممکن ہے، تمہارے سامنے اور بھی بڑے سرمایہ داروں کی تصویریں رکھی جائیں گی۔ ان کی بھی حسین بیویاں ہیں یا محبوبائیں ہیں۔ تم جو تصویر پسند کرو گے اسی تصویر کی صورت اور شخصیت میں تمہیں ڈھال دیا جائے گا۔''

''مجھے اور کوئی تصویر نہیں چاہیے۔ میں جبران بنا چاہتا ہوں۔ میں کشور جاناں کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری مرضی ہے۔ ایسا ہو جائے گا لیکن ایک بات یاد رکھنا ہم ہر حال میں اپنا منافع دیکھتے ہیں۔ کشور جاناں ایک کروڑ پتی عورت ہے۔ اس کے پاس جو ہیرے جواہرات ہیں انہیں تم ہمارے پاس پہنچاؤ گے وقتاً فوقتاً اس کی جائداد سے حاصل ہونے والے منافع کی رقم بھی ہمارے پاس پہنچاتے رہو گے اس کے عوض تمہیں ایک تو قانون سے پناہ ملے گی دوسرے کشور جاناں کی محبت حاصل ہوتی رہے گی۔''

''مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے لیکن مجھے تبدیل ہو کر جبران بننے میں تو کافی عرصہ لگے گا۔''

''ہاں تقریباً ایک سال کی مدت ہوگی۔ اس عرصے میں تم مکمل جبران بن جاؤ گے۔ تمہیں اس کی طرح بولنا، اس کی طرح لکھنا۔ اس کی طرح دستخط کرنا سکھایا جائے گا اور وہ کشور جاناں کے ساتھ خلوت اور جلوت میں کس طرح اٹھتا بیٹھتا اور باتیں کرتا ہے اور اس کی مخصوص عادتیں کیا ہیں۔ یہ سب تمہیں بتائی جائیں گی اور تمہیں اس پر عمل کرایا جائے گا۔''

عاصم نے کہا۔''جبران مر چکا ہے۔ میں ایک سال کے بعد جبران بن کر جب کشور جاناں کے پاس پہنچوں گا تو کیا وہ مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گی کہ میں ایک برس تک کہاں رہا تھا۔''

اس نے ریوالونگ چیئر پر پھر اِدھر سے اُدھر گھومتے ہوئے کہا۔''ہم تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد عمل کرتے ہیں۔ میں نے کشور جاناں کو ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دی ہے کہ جبران نے عاصم کو قتل کر دیا ہے۔ ہمارے پاس اس کے خلاف مکمل ثبوت ہے۔ لہٰذا ہم نے اسے چھپا کر رکھا ہے اور اسے ملک سے باہر بھیج رہے ہیں۔ اگر کشور جاناں اسے صحیح سلامت دیکھنا چاہتی ہے اور قانون کے حوالے نہیں کرنا چاہتی ہے تو وہ وقتاً فوقتاً ہمیں معقول رقم ادا کرتی رہے۔ تین ماہ کے بعد ہم اسے دور سے جبران کو دکھائیں گے اور ایک سال کے بعد جبران کو اس کے حوالے کر دیں گے یعنی ایک سال تک تم مکمل جبران بن کر اس کے پاس پہنچ جاؤ گے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔''یہ تو سراسر میرے فائدے کی بات ہے۔ میں کم سے کم عرصے میں جبران کی پوری شخصیت کو اپنانے کی کوشش کروں گا۔ میرا بس چلے تو میں ابھی مکمل جبران بن کر جاناں کے پاس پہنچ جاؤں۔''

وہ ریوارنگ چیئر پر سے میز پر جھکتے ہوئے بولا۔''لیکن ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ تمہاری اپنی جو پیدائشی صورت شکل ہے اور اب تک کی جو شخصیت ہے اس کا بھی ہم پورا ریکارڈ رکھیں گے۔ کیونکہ کبھی کسی موقع پر تمہیں تمہاری اپنی پہلی شخصیت کی طرف واپس آنا پڑے تو اس ریکارڈ کے ذریعے یاد دلایا جائے کہ تم کون تھے، کیا تھے، تمہاری تحریر کیسی تھی۔ تمہارے دستخط کیسے تھے اور تم اپنی بیوی یا دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ کس طرح اٹھتے بیٹھتے اور گفتگو کرتے تھے اور تمہاری مخصوص عادتیں کیا تھیں۔ ان تمام ریکارڈز کو محفوظ کرنے

کے بعد تمہیں جبران کی شخصیت کا سبق پڑھایا جائے گا۔ بولو، منظور ہے؟''
''منظور ہے۔''

☆======☆======☆

وہ اس عمارت میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بہت بڑی عمارت تھی۔ وہاں رہائش کا انتظام بھی تھا۔ اس کے لیے ایک بہت ہی آرام دہ کمرہ تھا، جبران کی آواز ایک کیسٹ ریکارڈر سے سننے اور اس کی نقل کرنے کے لیے ایک گھنٹہ مقرر تھا۔ پھر دوسرا ایک گھنٹہ جبران کی طرزِ تحریر کے مطابق لکھنے کی مشق میں گزرتا تھا۔ پتہ نہیں اس بلیک میلر نے جبران کی پوری ہسٹری شیٹ کیسے حاصل کی تھی۔ اس کی خلوت اور جلوت کی ایک ایک بات ان کے ریکارڈ میں موجود تھی اور عاصم ان کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ شاید اس بلیک میلر نے جبران کی زندگی میں ہی اسے کسی بات پر بلیک میل کیا ہو اور اس کی پوری ہسٹری شیٹ حاصل کر لی ہو جو اب عاصم کے کام آ رہی تھی۔

تنظیم تبدیلیٔ حیات کے ماہرین عاصم پر بڑی محنت کر رہے تھے اور تحریر و تقریر اور جبران کی عادات کو اپنانے کے سلسلے میں اس کی مدد کر رہے تھے اور اسے سمجھایا کرتے تھے کہ کس انداز سے مشق کی جائے تو وہ کامیابی سے جبران کی پوری طرح نقل کرنا سیکھ جائے گا۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ آرٹسٹ اور فوٹو گرافر تھے جو مختلف انداز میں اس کی تصویریں اتار رہے تھے۔ پھر گراف کے ذریعے اس کے چہرے اور جسم کا خاکہ بناتے تھے۔ پھر جبران کے خاکے سے اس کا موازنہ کرتے تھے اور اس میں ضروری تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔ یہ پلاسٹک سرجری کا ابتدائی مرحلہ تھا۔

تین ماہ کے عرصے میں عاصم نے کافی حد تک جبران کی آواز اور اس کے اندازِ گفتگو کی نقل کرنی سیکھ لی۔ ابھی اس میں کچھ خامیاں تھیں۔ اسے سمجھایا گیا کہ وہ ذرا بیمار رہ کر ایک زخمی کے انداز میں ٹیلیفون پر جاناں سے گفتگو کرے۔ اسی پُراسرار عمارت سے جاناں کے فون کا نمبر ڈائل کیا گیا اور رابطہ قائم ہوتے ہی ریسیور عاصم کے حوالے کیا گیا عاصم نے جبران کی آواز میں ذرا تکلیف سے کراہتے ہوئے مخاطب کیا۔'' جاناں میری جان، میں تمہارا جبران بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے جاناں کی مضطربانہ آواز سنائی دی۔'' ہاں جبران میں تمہاری

آواز پہچان رہی ہوں۔ مگر تمہاری آواز میں اتنی کمزوری کیوں ہے۔ کیا تم بیمار ہو؟''

''نہیں جاناں، میں نے عاصم پر گولی چلائی تھی۔ اس سے پہلے عاصم نے میرے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا تھا جس کی وجہ سے میں اب تک ایک ڈاکٹر کے زیر علاج رہا۔ میرے پیٹ میں ٹانکے لگا دیئے گئے ہیں۔ زخم بھر چکا ہے۔ مگر میں بہت کمزور ہوں۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا ہے۔ اسی لیے آواز میں شاید کچھ تبدیلی آ گئی ہے۔ میرا ذہن بھی کام نہیں کرتا ہے۔ بہت سی باتیں بھی بھول جاتا ہوں۔''

''جبران۔ تم بہت سی باتیں بھول سکتے ہو مگر مجھے کبھی نہیں بھول سکتے۔ ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں ان لوگوں سے خوشامد کر رہا ہوں کہ یہ مجھے رہا کر دیں اور جلد از جلد مجھے اپنی جاناں کے پاس پہنچنے کا موقع دیں۔ مگر میری منت وسماجت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔''

''میں بھی تو ان کا مطالبہ پورا کرتی رہتی ہوں۔ اب تک میں انہیں پانچ لاکھ دے چکی ہوں۔ میں تمہارے لیے اور بھی بڑی سے بڑی رقم دے سکتی ہوں۔ بشرطیکہ وہ تمہیں رہا کر دیں۔''

''تم فکر نہ کرو۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ جب میں پوری طرح صحت مند ہو جاؤں گا تو یہ مجھے یہاں سے تمہارے پاس جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

''تم اس وقت کہاں ہو جبران؟''

''یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ میں جہاں ہوں یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے لیکن اس عمارت سے باہر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔''

عاصم کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص دوسرا ریسیور اٹھائے ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کرتے ہوئے کہا۔'' جاناں باتوں باتوں میں سراغ لگانا چاہتی ہے کہ تم کہاں ہو۔ بس اتنی ہی گفتگو کافی ہے۔ اب وہ ہیلو، ہیلو کر رہی ہوگی تمہیں آوازیں دے رہی ہوگی۔ اسے ذرا تڑپنے دو۔''

عاصم کو اس حرکت پر غصہ آیا لیکن وہ غصہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ ویسے وہ اندر ہی اندر بہت خوش تھا۔ بہت عرصے بعد بعد اس نے جاناں کی آواز سنی تھی اور آواز بھی ایسی کہ جاناں اسے محبوبانہ انداز میں مخاطب کر رہی تھی اور اسے اپنا جبران سمجھ کر دل و جان سے

باتیں کر رہی تھی۔ جب وہ مکمل جبران بن کر جائے گا تو وہ دل و جان سے اس کی ہو کر اس کے ساتھ زندگی گزارے گی۔ یہ خوش آئند باتیں عاصم کے شوق کو ہوا دینے لگیں۔ وہ اور زیادہ لگن کے ساتھ جبران کی شخصیت کو اپنانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ پھر وہ وقت آ گیا جب اسے پلاسٹک سرجری کے لیے آپریشن کے مرحلے سے گزرنا پڑا ایسے وقت اس پر کیا گزرتی تھی اس کا اسے پتہ نہیں چلتا تھا کیونکہ اسے بے ہوش کر دیا جاتا تھا۔ جب وہ ہوش میں آتا تھا تو کبھی اس کی ناک پر، کبھی ہونٹوں پر، کبھی گالوں پر، کبھی پیشانی پر اور کبھی ٹھوڑی پر چھوٹی چھوٹی پٹیاں چپکی رہتی تھیں اور اس سے پتہ چلتا تھا کہ چہرے کو بتدریج تبدیل کیا جا رہا ہے۔

ایک آپریشن سے دوسرے آپریشن تک ایک ماہ کا وقفہ ہوتا تھا اس وقفے میں وہ جبران کی شخصیت کو اپنانے کی مشقیں کرتا رہتا تھا۔

دس ماہ کے بعد چہرہ مکمل ہو گیا لیکن ان لوگوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اسے ابھی کشور جاناں کے پاس پیش کیا جائے کیونکہ ابھی اس میں کچھ تکنیکی خامیاں رہ گئی تھیں۔ جنہیں بتدریج دور کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے فون کے ذریعے پھر ایک بار عاصم اور جاناں کی گفتگو کرا دی۔ اب عاصم پوری طرح بڑی بیباکی سے اور بڑی روانی سے جبران کی طرح بولنے لگا تھا۔ تحریر بھی بالکل ویسی ہی اپنائی تھی اور دستخط کا بھی ماہر ہو گیا تھا۔

پورا ایک سال گزر گیا۔ کشور جاناں کو ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ دوسرے دن اس کا جبران پہنچنے والا ہے۔ جاناں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہو گا لیکن ادھر عاصم کو دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے جبران کا رول پوری طرح ادا نہ کیا اور کبھی جاناں کی محبت کے نشے میں اپنی اصلیت اگل دی تو اس کے حق میں بہت برا ہو گا۔

دوسرے دن عاصم کو پھر اس بند گاڑی میں بٹھایا گیا۔ جس میں بیٹھ کر وہ ایک سال پہلے اس میں آیا تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور پھر پیچھے کی طرف تھوڑی دور تک چلتی گئی۔ اس کے بعد رک گئی۔ عاصم نے اندازہ کیا کہ وہ اس عمارت سے باہر نکل گئی ہے۔ کیونکہ اب وہ ایک طرف مڑ کر آگے کی طرف تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ باہر کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کس شہر یا علاقے میں ہے اور کہاں سے گزرتے ہوئے وہ شہداد پور پہنچنے والا ہے۔ اس گاڑی میں ایک سوراخ بھی نہیں تھا۔ جہاں سے وہ جھانک کر دیکھ سکتا۔

اس کے دل میں باہر جھانکنے کی خواہش تھی، تمام خواہشیں جاناں کے لیے مچل رہی تھیں۔ وہ اس خوشی میں مگن تھا کہ اب اسے جاناں حاصل ہو جائے گی اور برسوں کی مرادیں پوری ہو جائیں گی۔ وہ اپنی دولت سے اپنی طاقت سے اور خوشامدوں سے اس سنگدل محبوبہ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا لیکن تنظیم تبدیلیٔ حیات کے ماہرین نے ایک سال میں اس کی یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ اب اس کے اور جاناں کے درمیان برائے نام فاصلہ رہ گیا تھا اور اس فاصلے کو گاڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی طے کر رہی تھی۔

دوسری طرف کشور جاناں اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے آ کر رک گئی۔ یہ وہی مکان تھا جہاں ایک برس پہلے عاصم آیا تھا اور وہاں بیٹھ کر اس نے کیسٹ ریکارڈر سے اپنی اور جبران کی وہ آوازیں سنی تھیں جو ان کے لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کے نتیجے میں پیدا ہو رہی تھیں۔

بہر حال کشور جاناں ایک بریف کیس لے کر کار سے باہر آئی اور اس مکان میں داخل ہو گئی۔ وہاں چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ایک شخص سیاہ چشمہ پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آئیے مادام جاناں، مجھے یقین تھا کہ آپ اپنے وعدے کے مطابق رقم لے کر آئیں گی۔“

جاناں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جبران کہاں ہیں؟“

”آپ تشریف رکھیں۔ آپ کے شوہر ابھی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں لیکن اس سے پہلے میں رقم گن لینا چاہتا ہوں۔“

جاناں نے بریف کیس اس کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری آخری ادائیگی ہے۔ اس آخری ادائیگی کو ملا کر حساب کیا جائے تو میں پچھلے ایک سال میں اب تک ساڑھے چودہ لاکھ روپے ادا کر چکی ہوں۔ پہلے تین ماہ میں پانچ لاکھ دیئے۔ اس کے بعد تین لاکھ ادا کیے آج یہ پانچ لاکھ روپے ہیں۔ کل تیرہ لاکھ ہوئے۔ تم لوگوں نے میری وہ ڈیڑھ لاکھ کی گاڑی بیچ دی جسے جبران جائے واردات پر چھوڑ آئے تھے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ شخص بریف کیس کھول کر نوٹوں کی گڈیاں گن رہا تھا وہ مسکراتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”بیشک یہ آخری ادائیگی ہے۔ اب ہم تم سے ایک پیسہ بھی نہیں مانگیں گے اسی لیے تو تمہارے شوہر کو بھی واپس کر رہے ہیں۔“

جاناں نے تھکے ہوئے انداز میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں بہت بیزار ہوگئی ہوں۔ جبران کی محبت مجھے بہت مہنگی پڑی ہے۔ آج یہ بات کان کھول کر سن لو کہ اب جبران کے ذریعے کسی طور پر بھی بلیک میل کرو گے تو میری طرف سے یہی جواب ملے گا کہ جبران کو واپس لے جاؤ یا جبران کو قانون کے حوالے کر دو لیکن اب مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں خواہ مخواہ اتنی بڑی رقمیں ادا کرتی رہوں۔''

اس شخص نے نوٹ گننے کے بعد مطمئن ہو کر بریف کیس بند کر دیا۔ اسی وقت باہر گلی میں ایک گاڑی کے آ کر رکنے کی آواز سنائی دی اس نے کہا۔ ''مبارک ہو۔ آپ کے شوہر تشریف لے آئے ہیں۔''

جاناں کے دل میں کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا۔ ایک سال کی جدائی کے بعد وہ اپنے شوہر سے ملنے والی تھی لیکن اسے اندر سے اطمینان تھا کہ شوہر تو آ ہی رہا ہے۔ اتنی بے چینی کا اظہار کرنے کی کیا ضرورت ہے اس سے تو ابھی ناراضگی ظاہر کرنا ہے۔

اس کے سوچنے کے دوران عاصم دروازے پر پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی جاناں کھڑی ہوگئی۔ اس کے سامنے سر سے پاؤں تک جبران کھڑا ہوا تھا۔ عاصم نے مسکرا کر دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جاناں میری جان دیکھو میرا کیا حال ہوگیا ہے۔''

بلیک میلر بریف کیس اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔ عاصم جاناں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''بس میرے قریب نہ آنا۔ تم بالکل ہی نکمے اور غیر ذمہ دار آدمی ہو۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ عاصم کو قتل کرنے جاؤ اور خود اس مصیبت میں پھنس جاؤ۔ پھر مجھے بھی سال بھر تک مصیبتوں میں مبتلا رکھو اور اس بلیک میلر کو میرے پیچھے لگا دو۔ جانتے ہو اس وقت بھی وہ مجھ سے پانچ لاکھ روپے لے گیا ہے۔ اب تک ساڑھے چودہ لاکھ روپے ادا کر چکی ہوں۔''

عاصم نے ندامت سے کہا۔ ''جاناں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ عاصم تمہیں بری نظر سے دیکھے۔ میں ایک غیرت مند شوہر ہوں۔ میری غیرت نے مجھے بھڑکایا۔ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی۔ آئندہ میں کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ جس وجہ سے تمہیں پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑے اور تمہاری دولت بھی ضائع ہو۔ میں اپنی محنت سے دولت کماؤں گا اور تمہارا نقصان پورا کروں گا۔''

وہ جھڑک کر بولی۔ ''بس فضول باتیں نہ کرو۔ گھر چلو۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھتے ہوئے اس کے پاس سے ہوتے ہوئے جانے لگی اس وقت عاصم نے اس کے بازو کو پکڑ کر ایک طرف دھکا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، عاصم نے ایک زور کا طمانچہ اس کے گال پر رسید کر دیا وہ چیختی ہوئی پچھلی دیوار سے ٹکرا گئی۔ پھر عاصم نے اس کے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا۔ یہ سب کچھ جبران کی ہسٹری شیٹ میں تھا کہ وہ تنہائی میں جاناں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے اور جاناں کا مزاج بھی یہی تھا۔ وہ اذیت پسند عورت تھی۔ اچھی طرح مار کھانے کے بعد وہ جبران سے والہانہ محبت کرنے لگتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ عاصم کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ عاصم اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''بس اب گھر چلو۔ باقی ڈرامہ اپنے گھر میں ہوگا۔''

ڈرامہ خوب ہو رہا تھا۔ وہ جاناں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی میں پہنچا۔ وہاں جاناں کا بہت پرانا ملازم تھا۔ جسے عاصم بھی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ کچھ نئے ملازم تھے جن کے متعلق اسے معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی محبوبہ کے رشتہ داروں کو بھی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ویسے اب وہ محبوبہ نہیں بن بیاہی بیوی بن چکی تھی۔

عاصم اس کے ساتھ تنہائی میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے خواب دیکھتا ہوا آیا تھا لیکن جاناں نے کوٹھی میں پہنچنے سے پہلے ہی اسے بتا دیا کہ وہاں رشتہ دار اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ ''جبران میں نے اپنے رشتہ داروں کو یہ نہیں بتایا کہ تم نے عاصم کو قتل کیا ہے اور کسی بلیک میلر کے ہتھے چڑھ گئے ہو میں نے اپنے تمام خاندان والوں کو یہ تاثر دیا ہے کہ تم کامیاب فلم سازی کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے ہالی وڈ گئے ہوئے ہو۔ اب تم اسی کے مطابق میرے رشتہ داروں کو جواب دینا کہ تم ایک سال تک ہالی وڈ میں کیا کرتے رہے۔''

جاناں کے رشتہ دار رات کے کھانے تک کوٹھی میں رہے اور عاصم سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے اور عاصم بڑی کامیابی سے انہیں جواب دیتا اور خوب جھوٹ بولتا رہا۔ اس کے اندر جیسے سچ مچ جبران سما گیا تھا۔ اس سے کہیں کوئی غلطی نہیں ہو رہی تھی لیکن اس سلسلے میں ایک سوال اہم ہے۔

سوال یہ ہے، کیا انسان قدرت کے نظام کے خلاف خود کو بدل سکتا ہے۔ کیا اپنی

شخصیت کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی شخصیت کو مکمل طور پر اپنا سکتا ہے۔ اگر نقالی کے ذریعے اپنا لے اور پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنی صورت بدل لے تو کیا مزاج بھی بدل جاتا ہے۔ کیا اس کی پیدائشی عادت اور فطری تقاضے بدل جاتے ہیں؟

جب رات کو کھانے کا وقت آیا تو میز پر کھانے کی ڈشوں میں گوشت اور چنے کی دال کی ایک ڈش بھی تھی۔ عاصم بچپن ہی سے چنے کی دال پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کبھی کھا لیتا تو اسے ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ جبران کو چنے کی دال بہت پسند تھی۔ عاصم کے لیے بہت بڑی آزمائش کا وقت آن پہنچا۔ تبدیلیٔ حیات کے ادارے میں اسے چنے کی دال کھانے کی بھی مشق کرائی گئی تھی وہ جب بھی مشقوں کے دوران چنے کی دال کھاتا تھا تو اس کے پیٹ میں گڑبڑ شروع ہو جاتی تھی اور رات کو وہ سکون سے سو نہیں سکتا تھا۔

اسے مجبوراً کھانا پڑا۔ ایک تو وہ جاناں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اس کی خوشی کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ پھر وہ بحیثیت جبران اس ڈش سے کترا نہیں سکتا تھا۔ جبران تو ایسی ڈش پر ٹوٹ پڑتا تھا اور خوب پیٹ بھر کر کھاتا تھا۔ لہٰذا عاصم کو بھی پیٹ بھر کر کھانا پڑا۔

رات کے گیارہ بجے تمام رشتہ دار رخصت ہو گئے۔ اب تنہائی کے حسین لمحات تھے۔ محبت کے فرض کی ادائیگی تھی لیکن پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی تھی۔ وہ کبھی بیڈروم میں جاناں کے پاس بیٹھ کر پیار و محبت کی باتیں کرتا تھا کبھی باتھ روم کی طرف بھاگتا تھا۔ جاناں نے بیزار ہو کر پوچھا ''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا یہ پہلی بار چنے کی دال کھائی ہے؟''

''بلیک میلر کی قید میں ایک سال تک یہ دال کھانے کو نہیں ملی اس لئے ہضم کرنے کی پریکٹس نہیں رہی ہے۔''

وہ ناراض ہوتی رہی۔ عاصم اسے سمجھاتا مناتا رہا۔ کبھی وہ لڑتے رہے کبھی محبت کرتے رہے اور کبھی محبت کرتے کرتے لڑتے رہے۔ جاناں کو اپنے حسن اور اپنی دولت پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے غرور سے کبھی عاصم کو زیر کرتی تھی اور کبھی خود محبت سے زیر ہو جاتی۔

رات کے ڈھائی بجے عاصم سکون سے سو گیا۔ خوابگاہ میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اسی بستر پر جاناں چپ چاپ لیٹی ہوئی اندھیرے میں چھت کی طرف تک رہی تھی۔ اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے پاس جبران سو رہا تھا۔ مگر وہ جبران جانے کیوں اجنبی سا لگ رہا تھا۔ کوئی بات اسے کھٹک رہی تھی۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے قرضدار ہوتے ہیں۔ محبت

سے ایک دوسرے کا قرض ادا کرتے ہیں جاناں نے کسی بات کی کمی نہیں کی تھی لیکن عاصم نے محبت کا قرض چکانے میں کہیں کوئی کمی کی تھی جو جاناں کو کھٹک رہی تھی۔

وہ بڑی دیر تک اسی طرح لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر اچانک ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے پاس جو جبران سو رہا تھا وہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا جبکہ اس نے اپنے شوہر کو آج سے پہلے کسی رات بڑبڑاتے نہیں سنا تھا۔ وہ ذرا جھک کر کان لگا کر سننے لگی۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''میں جاناں کے لئے جان دے دوں گا۔ وہ میری محبت ہے۔ میری زندگی ہے، ارے تم۔ تم قبر سے اٹھ کر آ گئے۔ جبران کے بچے بھاگ جا۔ قبر میں جا کے سو جا۔ نہیں تو پھر چھرا گھونپ دوں گا۔''

تنظیم تبدیلیٔ حیات کے دفتر میں جبران کی جو ہسٹری شیٹ رکھی ہوئی تھی اس کی زندگی کا پورا ریکارڈ بچپن سے اب تک کا محفوظ تھا۔ اس میں شاید یہ نکتہ بیان کرنے سے رہ گیا تھا کہ جبران کو نیند میں بڑبڑانے کی عادت نہیں ہے اور عاصم نیند میں بڑبڑاتا ہے۔ تبدیلیٔ حیات کے ماہرین کے دماغوں سے بھی یہ نکتہ محو ہو گیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کے دماغ کے اندر بھی ایک وسیع کائنات بنائی ہے۔ اس کائنات میں سیاروں اور ستاروں کی طرح کتنے ہی قابلِ غور نکتے ٹمٹماتے رہتے ہیں۔ ان نکتوں کو نہ تو کوئی گن سکتا ہے نہ ہر ایک پر غور کر سکتا ہے۔ غور کرنے کے لیے جتنا دماغ کھپایا جائے گا اتنی معلومات تو حاصل ہوں گی لیکن سوچنے سمجھنے کے لیے پھر بھی بہت سے نکتے رہ جاتے ہیں۔

جاناں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ ''اے جی، اٹھو یہ تم کیا بڑبڑا رہے ہو؟''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر جلد ہی جاناں کو دیکھ کر اسے اپنی تبدیلی کا خیال آ گیا۔

جاناں نے پوچھا۔ ''تم ابھی نیند میں کیا کہہ رہے تھے؟''

اس نے پوچھا۔ ''میں کیا کہہ رہا تھا؟''

''یہی کہ جبران تم قبر سے اٹھ کر کیوں آ گئے ہو۔ واپس جاؤ۔ نہیں تو تم چھرا گھونپ دو گے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہوا۔ کیا تم اپنے آپ کو خواب میں قبر سے اٹھتے ہوئے دیکھتے ہو اور خود حکم دیتے ہو کہ تمہیں قبر کے اندر چلے جانا چاہئے؟''

عاصم نے پریشان ہو کر سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچا۔ پھر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر [illegible] سے

اٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ دال کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ پیٹ میں گڑبڑ ہے اب پتہ نہیں کیسے اوٹ پٹانگ قسم کے خواب آتے رہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ پھر تیزی سے چلتا ہوا باتھ روم میں آیا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے اطمینان کی گہری سانس لی اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ وہ ایک غلطی سے بال بال بچا تھا لیکن آئندہ بچنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔ یہ آج ایک ہی رات کی بات تو نہیں تھی۔ اسے اب جاناں کے ساتھ زندگی کی تمام راتیں بسر کرنی تھیں اور ان راتوں میں اس کے بڑبڑانے کا بھید کھلنے والا تھا۔

وہ تنظیم تبدیلیٔ حیات کے دفتر میں اطلاع پہنچا سکتا تھا کہ جبران بننے کے سلسلے میں ایک خامی رہ گئی ہے لیکن ڈر تھا کہ تنظیم والے خود اس پر چڑھ دوڑتے اور اسے یہ الزام دیتے کہ خود اس نے اپنی ہسٹری شیٹ پیش کرتے وقت یہ بات کیوں نہیں لکھی تھی کہ اسے نیند میں بڑبڑانے کی عادت ہے۔ اگر وہ یہ بات لکھ دیتا تو جبران کی ہسٹری شیٹ پر بھی غور کیا جاتا اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد اس کے بڑبڑانے کی عادت کو دور کیا جاتا۔

اب تو بات بگڑ چکی تھی اور وہ تنظیم والوں کو اطلاع دے کر ان کی دھمکیاں سننا نہیں چاہتا تھا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی ناپسندیدہ چیز کھانے سے پیٹ میں گڑبڑ ہو اور سکون سے نیند نہ آئے تو انسان ذہنی پریشانیوں میں مبتلا رہ کر نیند کی حالت میں بڑبڑاتا ہے۔ لہٰذا آئندہ وہ چنے کی دال نہیں کھائے گا۔

☆======☆======☆

دو سال گزر گئے۔

عاصم پہلے تو سنبھل سنبھل کر جبران کا رول ادا کرتا تھا۔ ہمیشہ محتاط رہتا تھا کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے لیکن مزید دو سالوں میں وہ اس قدر مہارت حاصل کر چکا تھا کہ اب اسے جبران بن کر رہنے کے لیے کچھ سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ بے اختیار جبران جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ صبح سے رات تک جاگنے کے دوران اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی تھی۔ وہ شعوری طور پر جبران کی حیثیت سے بیدار رہتا تھا۔

لیکن سونے کے بعد وہ اپنے اختیار میں نہیں رہتا تھا۔ نیند کی حالت میں اس کا دماغ بے قابو ہو جاتا تھا۔ پہلے دو چار ماہ اس نے بہانہ کیا کہ اسے اب یہ دال اچھی نہیں لگتی ہے

لیکن جاناں اس کے ساتھ اتنے برس تک ساتھ رہتے ہوئے اور ساتھ کھاتے ہوئے چنے کی دال کھانے کی عادی ہو گئی تھی۔ اب وہ شوق سے یہ ڈش تیار کرتی تھی اور کھانے کے وقت بڑی محبت سے اسے کھلاتی تھی اور محبت سے تو وہ جاناں کے ہاتھوں زہر بھی کھا سکتا تھا۔

کبھی کبھی جاناں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی، وہ پوچھتا۔ ”تم اس طرح مجھے کیوں تک رہی ہو؟“

وہ جواب دیتی۔ ”پتہ نہیں، کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم وہ پہلے والے جبران نہیں رہے۔ کچھ بدل گئے ہو۔“

اس کی باتیں سن کر وہ پریشان تو ہوتا تھا۔ مگر جبراً ہنستے ہوئے کہتا تھا۔ ”ہاں، میں ایک جادوگر ہوں اور جادو کے ذریعے جبران بن کر تمہارے حسن کی دولت لوٹنے آیا ہوں۔“

ایک بار جاناں اسے ایک ماہرِ نفسیات کے پاس لے گئی۔ عاصم نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟“

وہ عاصم کو نظرانداز کرتے ہوئے ماہرِ نفسیات سے بولی۔ ”ڈاکٹر! یہ میرے شوہر ہیں اور انہیں نیند میں بڑبڑانے کی عادت ہو گئی ہے حالانکہ پہلے یہ بالکل نہیں بڑبڑاتے تھے۔“

ماہرِ نفسیات نے کہا۔ ”کبھی کبھی انسان حالات کے باعث بدل جاتا ہے پریشانیوں میں مبتلا رہنے کے باعث نیند کی حالت میں بھی وہ ان سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے غیر شعوری طور پر نیند کی حالت میں بھی بولنے لگتا ہے۔“

عاصم نے کہا۔ ”آپ درست فرماتے ہیں۔ ہمارا کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے کہ میں اس کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ اسی کے نتیجے میں رات کو بڑبڑاتا ہوں۔“

جاناں نے کہا۔ ”مجھے پریشانی اس بات کی ہے کہ یہ نیند میں جو کچھ بڑبڑاتے ہیں ان کی بڑبڑاہٹ میری بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔“

ماہرِ نفسیات نے پوچھا۔ ”کیا آپ ان کی بڑبڑاہٹ کو نوٹ کرتی ہیں۔ اگر کرتی ہیں تو ان کے دو چار فقرے سنائیں۔“

جاناں نے کہا۔ ”یہ اکثر اپنے آپ کو ہی خواب میں دیکھتے ہیں اور اپنے آپ کو ہی

چیلنج کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بار یہ کہہ رہے تھے کہ جبران تم قبر سے اٹھ کر کیوں آ گئے۔ واپس چلے جاؤ ورنہ چھرا گھونپ دوں گا۔''

عاصم اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ جاناں نے کہا۔''ایک بار یہ نیند میں بڑبڑا رہے تھے۔ آہ میں نے جاناں کو سر سے پاؤں تک حاصل کر لیا ہے مگر افسوس وہ مجھے نہیں جبران کو چاہتی ہے۔ پیار و محبت کے دوران اس کے سامنے میں نہیں ہوتا جبران ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آخر اس بڑبڑاہٹ کا مطلب کیا ہوا؟''

عاصم نے پریشان ہو کر پوچھا۔''جاناں کیا واقعی میں نیند میں ایسی باتیں کرتا ہوں۔''

''بیشک، اگر ایسی الٹی سیدھی باتیں نہ کرتے تو میں تمہیں یہاں ڈاکٹر صاحب کے پاس کبھی نہ لاتی۔''

ڈاکٹر نے کہا۔''پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ان کا نفسیاتی تجزیہ کروں گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص نیند میں اپنے ہمزاد کو دیکھتا ہے تو اپنی شخصیت کو بھول جاتا ہے۔ مثلاً آپ کے یہ شوہر جبران صاحب جب نیند میں اپنے ہمزاد جبران کو دیکھتے ہیں تو خود یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ جبران ہیں اور اپنے سامنے والے جبران کو للکارتے ہیں۔ اسے اپنا رقیب سمجھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ آپ ان کے ہمزاد کو چاہتی ہیں اور ان کو نہیں چاہتیں۔''

ماہر نفسیات نے عاصم کے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں جن کے استعمال سے دماغی تھکن دور ہوتی تھی اور سکون سے نیند آتی تھی۔ آئندہ دو مہینوں کے دوران ماہر نفسیات سے کئی بار ملاقاتیں ہوئیں اور وہ نفسیاتی تجزیے کے لئے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا۔ عاصم جان بوجھ کر ایسے جواب دیتا تھا جن سے یہی رائے قائم کی جاتی تھی کہ وہ نیند میں اپنے ہمزاد جبران کو دیکھتا ہے۔ اس نے اپنے جوابات کے ذریعے ماہر نفسیات کے اس اندازے کو درست ثابت کر دیا۔ ماہر نفسیات نے جاناں کو بھی یہ یقین دلایا کہ یہ صاحب جب تک اپنے ہمزاد کو خواب میں دیکھتے رہیں گے اور اسے اپنا رقیب سمجھتے رہیں گے اس وقت تک اسی انداز میں بڑبڑائیں گے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے آپ زیادہ سے زیادہ پیار و محبت سے پیش آ کر انہیں یقین دلائیں کہ آپ انہیں دل و جان سے

چاہتی ہیں۔

عاصم نے بڑی خوبصورتی سے اس بگڑتی ہوئی بات کو بنا لیا۔ جاناں اس پر شبہ نہیں کر سکی لیکن عاصم کے لیے جو پریشانی کی بات تھی وہ بلیک میلر کا مطالبہ تھا۔ دو سال کے دوران ایک بار عاصم نے ہیرے کا ایک نیکلس چرا کر بلیک میلر کے پاس پہنچا دیا تھا۔ جاناں اس نیکلس کو تلاش کرتی رہ گئی تھی اور پریشانی سے بار بار بڑبڑاتی تھی کہ آخر نیکلس کون چرا سکتا ہے۔ گھر کے آدمیوں میں تو ایک تم ہو دوسرا پرانا ملازم ہے جس پر میں شبہ نہیں کر سکتی۔

عاصم نے پوچھا۔''تو کیا مجھ پر شبہ کرتی ہو؟''

وہ غصے سے بولی۔''فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں مگر نیکلس گھر سے کہاں جا سکتا ہے؟''

اس بات کا جواب جاناں کو نہیں مل سکا اور نہ ہی وہ نیکلس واپس مل سکتا تھا۔ دوسری بار بلیک میلر نے بہت زیادہ مجبور کیا تو عاصم نے اسے جاناں کی تجوری کا مخصوص نمبر بتا دیا جس کے ذریعے تجوری کا تالا کھولا جا سکتا تھا۔

جاناں کی خوابگاہ میں ایک چھوٹی سی آہنی تجوری تھی جس میں قیمتی زیورات اور روپے رکھے ہوئے تھے۔ ایک رات جب جاناں سو رہی تھی تو عاصم نے اٹھ کر اس تجوری کو مخصوص نمبروں سے کھولا۔ پھر اسے نئے نمبروں کی ترتیب کے ساتھ بند کر دیا۔

دوسرے دن جاناں نے کسی ضرورت سے تجوری کو کھولنا چاہا تو وہ پہلے والے نمبروں سے نہ کھل سکی کیونکہ ان نمبروں کی ترتیب بدل گئی تھی وہ بڑی پریشان ہوئی۔ اس نے عاصم سے پوچھا تو وہ بولا۔''کل تم نے جب تجوری کھولی تھی تو کچھ پریشان تھیں۔ تمہارے سر میں بھی درد تھا۔ اسے دوبارہ بند کرتے وقت تم نے نمبروں کی ترتیب غلط کر دی ہو گی۔ ایک نمبر کوئی ایسا غلط آ گیا ہے کہ تمہارے پہلے نمبروں کی ترتیب بدل گئی۔''

وہ بولی۔''پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا؟''

''ہو سکتا ہے پہلے تم نے پریشانی کے عالم میں تجوری کو نہ تو کھولا ہو نہ بند کیا ہو۔ یہ تو وقت وقت کی بات ہوتی ہے کبھی بھولے سے کوئی نمبر بدل جاتا ہے۔ جان بوجھ کر تو کوئی ایسا نہیں کرتا۔''

جاناں اس کی باتوں سے قائل ہو گئی۔ اب پریشانی اس بات کی تھی کہ وہ تجوری کیسے

کھلے گی۔ عاصم نے کہا۔" اسی دکاندار سے جا کر ملنا ہوگا جہاں سے تم نے یہ تجوری خریدی تھی۔ وہ اپنے میکینک کے ذریعے اس تجوری کو کھلوا دے گا۔"

وہ بولی۔" لیکن آج تو چھٹی ہے۔ دکانیں بند ہوں گی۔"

عاصم نے کہا۔" ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آج نہ سہی۔ کل تجوری کھلوا لینا۔"

اس روز وہ دونوں اسٹیج ڈرامہ دیکھنے کے لئے گئے۔ اس سے پہلے عاصم نے فون کے ذریعے چپ چاپ بلیک میلر کو تجوری کا نمبر بتا دیا۔ جب جاناں اس کے ساتھ ڈرامہ دیکھ کر واپس آئی تو کمرے میں پہنچتے ہی ٹھٹک گئی۔ کیونکہ تجوری کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے تجوری کے پاس آئی تو پتہ چلا کہ صرف جائیداد کے کاغذات تجوری میں رہ گئے ہیں۔ باقی نقدی اور زیورات کوئی سمیٹ کر لے گیا ہے۔ اس نے حیرانی سے چیخ کر پوچھا۔" یہ کیا ہو رہا ہے میں نے تجوری کھولنے کی کوشش کی یہ نہیں کھلی۔ پھر کون اسے کھولنے میں کامیاب ہو گیا، کون ایسا چور ہے جو میری تجوری کے پہلے نمبر کو بدل کر دوسرے نمبر سے اسے کھول سکتا ہے؟"

عاصم نے کہا۔" تمہارے چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تھانے میں رپورٹ لکھواؤ۔ پولیس والے شاید اس چور تک پہنچ سکیں۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ پھر اس کے بازو کو تھام کر کہا۔" جبران دیکھو، اس تجوری کو ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں کھول سکتا تھا اور جب کھول نہیں سکتا تھا تو اس کے نمبر کی ترتیب بدل کر اسے میرے لیے بند نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسے کھول نہ سکی۔ جس نے نمبر کی ترتیب بدلی ہے وہی کھول سکتا تھا اور اسی نے کھولا ہے۔"

"جاناں تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں تو تمہارے ساتھ تھا۔"

"بیشک تم میرے ساتھ تھے لیکن اس بدلے ہوئے نمبر کی ترتیب کو تم بلیک میلر تک تو پہنچا سکتے تھے۔"

اس نے گھبرا کر کہا۔" یہ تمہارے دماغ میں بلیک میلر کا خیال کیوں آیا؟"

"اس لئے کہ ایک بار میرا ہیرے کا نیکلس چوری ہو چکا ہے دوسری بار تجوری صاف ہو چکی یقیناً بلیک میلر تمہیں دھمکیاں دے رہا ہوگا۔ تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتا ہوگا اور تم اپنے بچاؤ کے لیے میری تجوریاں صاف کر رہے ہو۔ کیا میں غلط کہہ

رہی ہوں۔

"جاناں تم میرے خلوص پر میری محبت پر شک کر رہی ہو؟"

"میں شک نہیں کر رہی یقین کر رہی ہوں۔ دیکھو جانی، یہ بات اگر پولیس والوں تک پہنچی تو وہ یقیناً تم پر ہی شبہ کریں گے۔ بہتر ہے کہ تم میرے سامنے سچ بات اگل دو۔ میں نے تمہیں دوسری زندگی دینے کے لیے بلیک میلر سے نجات دلانے کے لیے لاکھوں روپے ضائع کر دیئے۔ کیا تم میری محبت اور میری وفا کی کوئی قیمت نہیں دو گے۔"

وہ اندر ہی اندر بہت شرمندہ ہوا لیکن کوئی بھی آسانی سے اپنے جرم اور گناہوں کا اقرار نہیں کرتا۔ شاید اس لیے کہ شرم آتی ہے یا اپنی غلطی مان لینے سے توہین کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے کی نظروں میں کمتری محسوس ہوتی ہے کتنی ہی احمقانہ وجوہات کی بنا پر لوگ اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس نے بھی ڈھیٹ بن کر کہا۔" جاناں میں تم پر جان دے سکتا ہوں۔ تمہیں کسی طور لوٹ کھسوٹ کر برباد نہیں کر سکتا۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو تھانے میں رپورٹ لکھواؤ اور مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔"

جاناں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔" نہیں تم میری محبت کو نہیں سمجھ سکے۔ پہلے میں محبت کرتی تھی۔ شادی کے بعد میں تمہاری عزت بن گئی اور تم میرے وقار کا سوال بن گئے ہو۔ تم پولیس کی حراست میں جاؤ گے عدالت میں پہنچ کر جیل جاؤ گے تو میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

"اتنی بڑی چوری کی واردات کو تم میری خاطر چھپا رہی ہو۔ آئندہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کسی طرح کبھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔"

"آئندہ میں بھی محتاط رہوں گی۔ نہ تمہیں اپنی تجوری کا نمبر بتاؤں گی نہ میرے زیورات ایسے کھلے پڑے رہیں گے کہ تمہارا ہاتھ وہاں تک پہنچ سکے اور نہ وہاں سے نکالنے کی ذمہ داری تمہیں دی جائے گی۔ میں ایسی پابندیاں عائد کروں گی کہ بلیک میلر تم سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکے گا۔"

جاناں کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ دو ماہ کے اندر اس نے رفتہ رفتہ تمام کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عاصم یا تو سارا دن گھر میں بیٹھا رہتا تھا یا کہیں تفریح کے لیے نکل جاتا تھا۔ جیب خرچ کے لیے اسے منہ مانگی رقم ملتی تھی لیکن جاناں اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ بس

میاں بیوی کے سے تعلقات تھے جن میں محبت نہیں ہوتی ۔بس فرض ادا کرنے والی بات ہوتی ہے۔

عاصم کو اب شبانہ یاد آنے لگی تھی۔ کچھ بھی ہو وہ بیوی کی حیثیت سے اسے بہت چاہتی تھی۔اس کا ہر حکم مانتی تھی۔ جاناں کی طرح حکم نہیں چلاتی تھی۔ وہ اگرچہ فلسٹار تھی۔ تاہم ایک محبت کرنے والی وفادار بیوی تھی۔ اب عاصم کو احساس ہو رہا تھا کہ بیوی اصل میں وہی تھی اور جاناں اب تک محبوبہ ہی رہی۔ کیونکہ وہ ایک عاشق کی طرح اس کے ناز نخرے اٹھاتا تھا اور بیویوں کے نخرے تو کوئی بھی شوہر نہیں اٹھاتا۔ اس لیے ایسے وقت اس شوہر کو اپنی بیوی شبانہ یاد آ رہی تھی۔

چھ ماہ بعد عاصم نے بیزار ہو کر کہا۔''جاناں، میں بیکار بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں۔ میرے پاس کوئی کام، کوئی مصروفیت ہونی چاہیے۔''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اور کیا کروں گا۔ایک ہدایت کار ہوں۔فلم بنا سکتا ہوں۔''

''تو پھر کسی فلمساز سے بات کرو۔''

''کیا تم فلمساز نہیں بن سکتیں۔تمہارے پاس دولت کی کمی تو نہیں ہے؟''

''بیشک کمی نہیں ہے لیکن میں تمہاری فلم میں ایک پیسہ بھی نہیں لگاؤں گی میں جانتی ہوں جو رقم بھی لگاؤں گی وہ تم ادھر بلیک میلر کو لے جا کر دے دو گے۔ بائی دی وے کیا بلیک میلر نے تمہیں یہ تدبیر بتائی ہے کہ تم فلمسازی کے بہانے مجھ سے بڑی بڑی رقمیں لے سکتے ہو۔''

''بلیک میلر سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہے۔تم خواہ مخواہ مجھ پر شبہ کرتی ہو بہر حال جانے دو اس بات کو۔ میں اب تم سے کسی بھی کاروبار کے سلسلے میں بات نہیں کروں گا۔''

چھ ماہ کے بعد اچانک ہی اس بلیک میلر سے ملاقات ہو گئی۔ عاصم رات کے نو بجے ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے سینما ہال سے باہر آ کر واپس پارکنگ ایریا میں پہنچا اور اپنی کار میں بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک بھکاری نے آ کر پیچھے سے پکڑ لیا۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔''یہ کیا حرکت ہے، دور ہٹو۔''

بھکاری نے اپنے سر سے چادر ہٹائی تو عاصم اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے

سامنے وہ بلیک میلر کھڑا ہوا تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ برسوں سے نہیں تو مہینوں کا بیمار ہے اور فاقہ زدہ بھی لگتا تھا۔ عاصم نے نے حیرانی سے پوچھا۔''تم؟ اور تمہاری یہ حالت؟''

''ہاں، میں بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ پولیس میرے پیچھے ہے اور میں چھپتا پھرتا ہوں۔''

''تمہاری وہ پُر اسرار عمارت کیا ہوئی جو تنظیم تبدیلیٔ حیات کا ہیڈ کوارٹر تھی؟''

''پولیس والوں نے اچانک ہی چھاپہ مارا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بڑی بڑی رشوتیں پیش کیں مگر بات نہیں بنی۔ پولیس والوں کو باتوں میں لگانے کے دوران ہم نے کتنے ہی ریکارڈ ضائع کر دیئے۔ ان میں تمہارے بھی ریکارڈ تھے لیکن ہم اس تبدیلیٔ حیات کے ادارے کو نہ بچا سکے۔ وہاں پولیس والوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہمارے سارے لوگ گرفتار ہو گئے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا لیکن مجھے اب کہیں پناہ نہیں ملتی ہے۔ میری ساری آمدنی کچھ تو بنک میں تھی اور کچھ وہیں اسی عمارت میں ایک جگہ میں نے چھپا کر رکھی تھی لیکن اب اس میں سے ایک پیسہ بھی میں خرچ نہیں کر سکتا۔ میرے بنک اکاؤنٹ کو بھی پولیس والوں نے سیل کر دیا ہے۔''

''اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

وہ ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگا۔''مجھے کچھ رقم دے دو۔ میں اپنا علاج کراؤں گا۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ پیٹ بھر کر روٹی کھاؤں گا۔''

عاصم نے حقارت سے کہا۔''تم وہی ہو نا جس نے جاناں سے لاکھوں روپے وصول کئے۔ اس کے ہاں چوری کی۔ میں تمہاری وجہ اس کی نظروں سے گر گیا اور اب تم مجھ سے پیسے مانگ رہے ہو۔ میں تمہیں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔''

''اتنا تو سوچو کہ میں نے تمہیں پھانسی کے پھندے سے بچایا۔ تمہیں عاصم سے جبران بنا دیا۔ تم شبانہ سے بیزار تھے اور جاناں کے دیوانے تھے میں نے تمہیں جاناں کا شوہر بنا کر اس کے پاس بھیج دیا۔ میرا کچھ تو احسان مانو کچھ تو مجھے دے دو۔''

''تم نے جو کچھ کیا غلط کیا۔ ناجائز کیا۔ قدرت کے خلاف کیا میں جبران بن کر

پچھتا رہا ہوں۔سوچتا ہوں شبانہ میری بہترین وفادار بیوی تھی۔ میں نے اس کی قدر نہیں کی۔ میرا جی چاہتا ہے تم پر تھوک دوں۔''

یہ کہہ کر وہ کار کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا۔اس بلیک میلر بھکاری نے آگے بڑھ کر دروازے کی کھڑکی پاس کھڑے ہو کر پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔''خدا کے نام پر مجھے صرف پانچ روپے دے دو چلو دو روپے دے دو میں صبح سے بھوکا ہوں۔''

''بکواس مت کرو۔ میں تمہیں کھلانے کے بجائے ایک کتے کو کھلانا کارِ ثواب سمجھتا ہوں۔''

جب اس بلیک میلر نے دیکھا کہ بھیک نہیں ملے گی تو وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔''دیکھو مسٹر عاصم، تم عاصم ہو جبران نہیں ہو۔میں چاہوں تو ابھی جاناں کے پاس جا کر تمہارا بھانڈا پھوڑ سکتا ہوں۔''

عاصم نے کہا۔'' کیسے بھانڈا پھوڑو گے۔کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ میں عاصم ہوں۔میں سر سے پاؤں تک جبران ہوں اور جبران کی حیثیت سے جاناں کے دل و دماغ پر اپنی دھاک بٹھا چکا ہوں۔''

وہ بے بسی سے بولا۔''ہاں، تمہیں عاصم ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔میں بس یونہی غصے سے کہہ رہا تھا۔خدا کے لیے مجھے کچھ دے دو۔''

عاصم نے کار اسٹارٹ کی۔پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔''میرے خلاف جاناں سے کچھ کہنے کے لیے آؤ گے تو خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے آنا۔میں خود تمہیں پولیس کے حوالے کرنے میں پہل نہیں کروں گا۔تمہاری سزا یہی ہے کہ تم فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ۔''

وہ تیزی سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی جاناں کی طرف جانے لگا۔وہ اس بلیک میلر کے متعلق سوچ رہا تھا کہ قدرت نے اس سے کیسا انتقام لیا ہے۔وہ کیسا برسوں کا بیمار اور فاقہ زدہ دکھائی دے رہا تھا۔یقیناً چار وقت کا مہمان ہوگا۔بھوکا رہے گا تو مر جائے گا۔اگر کسی نے روٹی کھلا دی تو دوا اور علاج کے بغیر زندہ نہیں سکے گا۔کبھی وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ اب ہمیشہ کے لیے بلیک میلر کے چنگل سے نکل چکا ہے۔اب اسے کسی کا خوف نہیں ہے اسے شبانہ بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔اس نے اسی وقت شبانہ سے ملنے کا

فیصلہ کر لیا۔ارادہ تھا کہ ابھی جا کر جاناں سے کہے گا کہ وہ دو دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے اور پھر وہ اپنی شبانہ کے شہر تک پہنچ جائے گا۔

اس نے کوٹھی کے پورچ میں پہنچ کر گاڑی کا ہارن بجایا۔یہ اس کی عادت تھی۔کوٹھی کے اندر جاناں کے بیڈروم میں گہری تاریکی تھی ہارن سنتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔پھر گھبرا کر بولی۔''جبران نے تو کہا تھا کہ نائٹ شو دیکھ کر بارہ ایک بجے تک واپس آئے گا۔یہ اتنی جلدی کیسے آ گیا بہرحال گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔تم پلنگ کے نیچے چھپ جاؤ میں اسے سنبھال لوں گی۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنی خوابگاہ کا دروازہ کھول کر باہر آئی پھر اسے باہر سے بند کر دیا۔اس وقت تک عاصم سیٹی بجاتا ہوا خوشی سے جھومتا ہوا آ رہا تھا۔جاناں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''بیڈروم کے اندر مت جاؤ۔ابھی میں نے ڈی،ڈی،ٹی اسپرے کیا ہے۔جب کیڑے مکوڑے اور مچھر مر جائیں گے۔پھر میں دروازہ کھولوں گی۔آؤ ہم تھوڑی دیر لان میں بیٹھیں گے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کوٹھی کے باہر لے آئی۔باہر گاڑی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔''جبران آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں کباب پراٹھے کھاؤں۔''

''تو پھر آؤ۔ہم گاڑی میں بیٹھ کر چلتے ہیں۔کسی اوپن ایئر ریسٹوران میں بیٹھ کر کھائیں گے۔''

''نہیں، تم دیکھ رہے ہو۔میرا لباس ٹھیک نہیں ہے۔اب میں بیڈروم میں جا کر لباس تبدیل نہیں کر سکتی۔وہاں دوا کی بو سے سر چکرائے گا۔کیا تم اکیلے گاڑی میں جا کر میرے لیے کباب پراٹھے نہیں لا سکتے۔پلیز میرا دل چاہ رہا ہے۔''

اس نے جاناں پر قربان ہوتے ہوئے کہا۔''تم اتنی محبت سے کہہ رہی ہو تو ابھی جاتا ہوں۔''

وہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑا۔جاناں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔پھر تیزی سے چلتی ہوئی کوٹھی کے اندر جانے لگی۔ادھر عاصم کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کل صبح شبانہ سے ملنے کے لیے جائے گا۔جاناں پوچھے گی تو اسے کہے گا کہ وہ ایک فلمساز سے اپنی آئندہ فلم کے سلسلے میں ایک طویل گفتگو کے لیے جا رہا ہے۔وہاں فلم

کی کہانی اور بجٹ پر بحث ہوگی۔ اس سلسلے میں کم از کم دو دن لگ جائیں گے۔ لہٰذا وہ دو دن کے بعد واپس آئے گا۔''

وہ سوچ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اسے جبران کی حیثیت سے جو بیوی ملی تھی اسے دھوکہ دے کر اس بیوی کی طرف جانے میں کتنا لطف آ رہا تھا۔ کتنی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے شبانہ کبھی بیوی نہ رہی ہو بلکہ محبوبہ ہو اور اب وہ بیوی کو دھوکہ دے کر محبوبہ سے ملنے والا ہو۔ ایسا سوچتے وقت سوچنے والے کے اپنے گھر میں کیا ہوتا ہے، اسے نہ تو اس بات کا علم ہوتا ہے نہ وہ شبہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ اکثر خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔

☆======☆======☆

دوسرے دن شام کو عاصم اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ وہاں شبانہ شوٹنگ میں مصروف تھی۔ اسے دور سے دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر اسے بڑی چاہت سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ اس سے قربت کیسے حاصل کرے۔ وہ جبران کو لفٹ نہیں دیتی تھی بس رسمی سی گفتگو کیا کرتی تھی۔

شبانہ اس وقت ایک دیہاتی لڑکی کا رول ادا کر رہی تھی اور ایسی جاذب نظر تھی کہ نظریں اسی میں جذب ہو رہی تھیں۔ اگرچہ وہ بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ کافی عرصہ گزار چکی تھی لیکن آج بالکل نئی اور اچھوتی دکھائی دے رہی تھی۔

ایک شاٹ میں شبانہ کو دیہاتی لڑکی کی حیثیت سے ایک ٹیلے پر سے چھلانگ لگانی تھی۔ پھر وہاں سے وہ کیمرے کی فریمنگ سے باہر آ جاتی۔ جب شاٹ شروع ہوا اور وہ دوڑتی ہوئی آ کر ٹیلے پر چڑھ گئی اور پھر ٹیلے سے اس نے چھلانگ لگائی تو ایک دم سے لڑکھڑا کر لرزنے لگی۔ عاصم نے تیر کی طرح اس کے پاس پہنچ کر اسے دونوں بازوؤں میں سنبھال لیا۔ وہ گرنے سے بچ گئی لیکن اس کے بازوؤں میں تھم کر اور جیسے جم کر رہ گئی۔ وہ فوراً ہی الگ ہو کر اس کا شکریہ ادا کر سکتی تھی لیکن جانے کیوں وہ الگ نہ ہو سکی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں کی کھوئی ہوئی منزل مل گئی ہو۔

ڈائرکٹر کی آواز نے چونکا دیا۔ ''جبران صاحب، آپ کا بے حد شکریہ، آپ نے بڑی پھرتی دکھائی ورنہ میڈم بری طرح زخمی ہو جاتیں۔''

شبانہ جلدی سے الگ ہو کر مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کرنے لگی لیکن اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اس کا دماغ تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ جانے کیوں اس کے بازوؤں میں اپنائیت محسوس کرنے کے بعد جیسے کسی اپنے سے دور ہو گئی ہو۔ وہ کچھ ایسی ہی باتیں سوچ رہی تھی۔

جانے کیسی کشش تھی۔ وہ اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم تو شہداد پور ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر ہمارے شہر نہیں آئے۔''

عاصم نے کہا۔ ''جاناں کا کاروبار بہت وسیع ہے میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ اب میں دو دن کے لئے آیا ہوں۔ کسی ہوٹل میں قیام کروں گا۔''

شبانہ نے آنکھیں دکھا کر کہا۔ ''کیوں غیروں کی طرح باتیں کرتے ہو۔ ہوٹل میں کیوں رہو گے۔ ابھی تو میرے ساتھ گھر چلو گے۔ میری انیکسی میں رہو گے اور ابھی رات کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھاؤ گے۔''

شبانہ نے شوٹنگ پیک اپ کرا دی۔ اس کے ساتھ سیٹ سے باہر آئی اور کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور گاڑی چلانے لگا۔ عاصم پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا کن انکھیوں سے کبھی اسے دیکھتا تو اسے بھی کن انکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا۔ پھر وہ دونوں چوری پکڑی جانے پر مسکرانے لگتے۔ آخر عاصم نے بڑی ہمت کر کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

وہ کچھ نہیں بولی، کیسے بولتی۔ وہ تو کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی یوں لگ رہا تھا کہ برسوں کے بعد اس کے عاصم کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر آیا ہو۔ ادھر عاصم کا حوصلہ بڑھتا گیا اور وہ انگلی سے پہنچے تک پہنچتا گیا۔ اس نے راستے میں پوچھا۔ ''تم نے دوسری شادی کی ہوگی؟''

شبانہ نے چونک کر پوچھا۔ ''کیوں میں دوسری شادی کیوں کروں گی۔''

''اس لیے کہ عاصم تو تمہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔''

وہ نفرت سے منہ بنا کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ عاصم نے پوچھا۔ ''تم نے جواب نہیں دیا؟''

''کیا جواب دوں۔ بس عاصم کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کرو اپنی سناؤ۔''

شبانہ کی بیزاری دیکھ کر عاصم نے حیرانی سے سوچا۔ ''یہ مجھے کس قدر چاہتی تھی اور اب میرے ذکر سے بیزار ہو رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ میں عاصم کا ذکر نہ کروں۔''

وہ دوسرے پہلو سے سوچنے لگا۔ ٹھیک تو ہے۔ میں شبانہ کو دھوکہ دے کر چلا گیا تھا۔ ایک فرضی بلیک میلر بن کر اسے فون کیا تھا اور شہداد پور سے جانے پر مجبور کیا تھا۔ اسے یہ تاثر دیا تھا کہ میں چھپنے کے لیے احمد نگر کی طرف جا رہا ہوں اور پھر وہاں سے بھی دور نکل جاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے اس بے چاری کی خبر نہیں لی۔ کچھ بھی ہو یہ میری جائز بیوی ہے۔ میں نے اس سے غافل ہو کر اس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اگر اب یہ میرے ذکر سے بیزار ہو جاتی ہے اور نفرت کرتی ہے تو ٹھیک ہی کرتی ہے۔

وہ شبانہ کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ وہ کوٹھی ویسی ہی تھی۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ شبانہ اسے ڈرائنگ روم میں لے کر آئی۔ وہاں ایک دیوار پر عاصم کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر عاصم کو عجیب سا لگا۔ وہ اس لیے کہ تقریباً پونے تین برس سے جب بھی وہ آئینے کے سامنے جاتا تھا تو آئینے میں اسے اپنا نہیں، جبران کا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ اپنا چہرہ دیکھنا بھول گیا تھا۔ بس ایک ہلکا سا خاکہ اس کے ذہن میں تھا کہ جبران بننے سے پہلے وہ کیسا تھا اب تصویر کو خاص طور سے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے دل سے ایک آہ نکل گئی کہ وہ کتنا خوبرو تھا اور جاناں کی محبت میں بدصورت جبران بن گیا تھا۔

کھانے کے دوران اس نے سوچا کہ شبانہ سے پوچھے کہ وہ اکیلی کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ پھر اس کے دماغ نے سمجھایا کہ کس منہ سے پوچھو گے۔ خود تو اس سے چھپے ہوئے ہو۔ کبھی اس کی خبر نہیں لی اور اب اس کی تنہا ویران زندگی کو کریدنا چاہتے ہو۔ کیوں ظلم کرنا چاہتے ہو۔

اس نے اپنے متعلق کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شبانہ بہت خوش تھی۔ اس نے کہا۔ ''جبران، جب تم نے مجھے اسٹوڈیو میں گرنے سے سنبھال لیا تو اس وقت مجھے عجیب سا لگا۔ میں سمجھ نہ سکی کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں پھر تم نے یہاں آتے وقت گاڑی میں بیٹھ کر میرے ہاتھ کو تھام لیا تب مجھے اچانک عاصم کی یاد آئی۔ یوں لگا جیسے میں نے عاصم کو آج برسوں کے بعد پایا ہے اگر تمہارا چہرہ جبران کا چہرہ نہ ہوتا یا تاریکی میں تم میرا ہاتھ پکڑ لیتے تو میں تمہیں عاصم ہی سمجھتی۔''

کھانے کے بعد عاصم نے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ ''یہاں کی لائٹ آف کر دو۔ اندھیرا ہو جائے گا تو مجھے عاصم ہی سمجھ لینا۔''

شبانہ کا دل تو اسے عاصم ہی سمجھ رہا تھا۔ اگرچہ وہ بظاہر جبران نظر آتا تھا۔ رات گزرنے لگی۔ جب گہری تاریکی چھائی ہو۔ آدمی کو آدمی نہ دکھ سکتا ہو اور ایسا اندھیرا ہو کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو تو ایسے وقت بھی شبانہ اس کے ہاتھوں کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''وعدہ کرو اب تم ہمیشہ شہداد پور سے آیا کرو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہفتے دس دن میں ایک بار ضرور آؤں گا اور تم سے ملا کروں گا۔''

''جبران، میں بڑی نادان تھی۔ میں نے عاصم کی محبت میں تمہاری قدر نہیں کی۔ تمہیں ٹھکرا دیا اور اس سے شادی کر لی۔ کاش کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوتی اور تم میرے ہوتے۔''

عاصم نے پوچھا۔ ''آخر تم اچانک ہی مجھ پر مہربان کیسے ہو گئیں؟''

''بس کیا بتاؤں۔ اس وقت اسٹوڈیو میں تم نے مجھے یوں سنبھالا ہے کہ اب تمہارے ہاتھوں سے ہی سنبھلتے رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے خود حیرانی ہے کہ عاصم کو پایا تو مجھے اپنا عاصم نہیں ملا اور جبران کو پا رہی ہوں تو جبران کے پیچھے مجھے عاصم مل رہا ہے۔''

''گویا تمہارا آئیڈیل عاصم تھا اور اب بھی تمہارے دماغ سے عاصم ہی جھانک رہا ہے۔''

''نہیں، اب وہ میرے دماغ سے نہیں جھانکے گا۔ اب میرے دماغ میں تم رہو گے اور اگر کوئی میرے دماغ کا فوٹو اتار سکتا ہے تو اسے نظر آئے گا کہ اس دماغ کی کھڑکی سے اب تم جھانک رہے ہو۔''

دوسرے دن وہ اور شبانہ تفریحی مقامات کی سیر کرتے رہے۔ خوب ہنستے بولتے رہے اور ہوٹلوں میں کھاتے پیتے رہے۔ اس دوران عاصم کے دماغ میں رہ رہ کر یہی بات ابھرتی تھی کہ آئیڈیل کیسے بدل جاتا ہے۔ عورت کے دماغ سے جو پہلا آئیڈیل جھانکتا ہے وہ حالات کے ساتھ کس طرح دماغ کی تہہ میں دفن ہو جاتا ہے اور کوئی نیا چہرہ جھانکنے لگتا ہے۔ شبانہ کے دماغ کے اندر عاصم مر چکا تھا یا مرتا جا رہا تھا اور اس کے دماغ سے جبران کا

چہرہ طلوع ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ دن ہنستے بولتے گزر گیا۔ پھر رات آ گئی۔ جو رشتے دن کے اجالے میں اندھے ہو جاتے ہیں انہیں رات کی تاریکی میں بینائی مل جاتی ہے۔ اندھیرے میں ان کی سچائی ظاہر ہو جاتی ہے۔ شبانہ عاصم کو محسوس کر رہی تھی۔ مگر جبران کا چہرہ رکھنے والے کو عاصم نہیں کہہ سکتی تھی۔ اگر اس سے پوچھا جاتا تو وہ یہی کہتی۔ ''عورت کے دماغ سے آخری سانس تک ایک ہی آئیڈیل جھانکتا ہے۔ خواہ عورت کتنی ہی بد چلن ہو۔ خواہ وہ ایک کے بعد دوسرے کا منہ دیکھتی ہو۔ مگر جو ایک بار دماغ میں آ جاتا ہے اس کی جگہ کوئی دوسرا نہیں لیتا۔ میں ابھی عاصم سے بے وفائی کرتے ہوئے جبران کے پاس ہوں لیکن کوئی میرے محسوسات کو سمجھے میں جبران میں عاصم کو پا رہی ہوں۔ میری یہ بات جس کو سمجھ آ جائے گی، وہ مجھے بے وفا نہیں کہے گا۔ بلکہ عاصم کو الزام دے گا کہ جو عاصم میرے پاس پونے تین برس سے ہے وہ مجھے اپنا عاصم کیوں نہیں لگتا؟''

اچانک کوٹھی کے پورچ سے کار کا ہارن سنائی دیا۔ شبانہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئی گھبرا کر بولی۔ ''عاصم نے تین دن کے بعد آنے کو کہا تھا، یہ اتنی جلدی واپس کیوں آ گیا؟''

عاصم نے حیران سے پوچھا۔ ''عاصم؟''

وہ بولی۔ ''فکر نہ کرو پلنگ کے نیچے چھپ جاؤ، میں اس سے نمٹ لوں گی۔''

وہ اندھیرے میں تیزی سے چلتے ہوئے خواب گاہ کے دروازے سے باہر گئی پھر باہر سے دروازے کو لاک کر دیا۔ عاصم کے اندر تجسس بھڑک رہا تھا، وہ پلنگ کے نیچے دبک کر نہیں رہ سکتا تھا، وہ بھی دبے قدموں دروازے کے پاس آیا اور کی ہول سے ایک آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔ دروازے کے دوسری طرف کاریڈور میں شبانہ کے لباس کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا پھر عاصم کو اپنی آواز سنائی دی۔

ہاں۔ اپنی آواز۔ کوئی کاریڈور میں تھا اور ہو بہو عاصم کی آواز میں شبانہ سے کہہ رہا تھا۔ ''میری جان! تم حیران ہو گی کہ میں اتنی جلدی کیسے آ گیا؟''

کی ہول سے باہر شبانہ کا ایک ہاتھ نظر آیا وہ راستہ روکے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''ٹھہرو۔ اندر کمرے میں نہ جاؤ۔ میں نے ابھی ڈی ڈی ٹی اسپرے کیا ہے، اندر

بڑی تیز قسم کی بو ہے۔''

ایسا کہتے ہوئے آنے والے نے اور قریب آ کر شبانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ تب عاصم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے کی ہول کے باہر ایک عاصم کو دیکھا۔ اِدھر بھی عاصم، اُدھر بھی عاصم۔ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیسے یقین آ جاتا؟ وہ خود جبران کے روپ میں اصلی عاصم تھا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے سامنے اپنے آپ کو دیکھے گا۔ جب کہ آئینہ کے سامنے بھی وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

یہ ہمزاد کہاں سے آ گیا؟ عاصم کا سر چکرانے لگا۔ کاریڈور میں شبانہ دوسرے عاصم سے کہہ رہی تھی۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے، رس ملائی کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔''

''تو پھر آؤ۔ ہم گاڑی میں جائیں گے اور..........''

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''نہیں، تم جاؤ۔ تمہارے واپس آنے تک کمرے میں پنکھا فل اسپیڈ سے چلتا رہے گا، ڈی ڈی ٹی کی بو نکل جائے گی۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کوٹھی کے باہر لے گئی۔ عاصم کی ہول کے پاس سے ہٹ کر سوچنے لگا۔ ''بالکل میرے جیسی صورت، میرے جیسا قد، جسامت، صحت، آواز اور لب ولہجہ ہے۔ اندازِ تخاطب بھی وہی ہے۔ میں شبانہ کو میری جان کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ یہ بھی وہی انداز اختیار کرتا ہے۔ کون ہے یہ؟''

پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھل گیا۔ شبانہ نے اندر آتے ہی لائٹ آن کرتے ہوئے کہا۔ ''جبران! فوراً اپنا سوٹ کیس لے کر باہر چلے جاؤ اور یہ بتاؤ پھر کب ملاقات ہو گی؟''

وہ سوٹ کیس اٹھا کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''یہ ابھی کون آیا تھا؟''

وہ بولی۔ ''تم نے کمرے کے اندر سے آواز تو سنی ہو گی، وہ عاصم تھے میرے شوہر۔''

وہ کوٹھی کے باہر آ گئے۔ عاصم نے کہا۔ ''مگر میں نے تو سنا تھا کہ عاصم تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے؟''

''تم نے غلط سنا تھا، اب جاؤ۔''

''جاتا ہوں۔ اتنا بتا دو، عاصم نے میرے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا تھا، تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں مردہ تھا۔ زندہ کیسے ہو گیا؟''

"تم مردہ ہوتے تو تمہاری روح سے پوچھتی۔ کیسی احمقانہ بات پوچھ رہے ہو۔ یہاں سے دومیل دور معروف مٹھائی والے کی دکان ہے۔ میں نے عاصم کو تاکید کی ہے کہ اسی دکان سے رس ملائی لے کر آئے۔ اسے آنے میں ابھی دیر لگے گی مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ تمہیں فوراً یہاں سے جانا چاہیے۔"

وہ ایک ہفتہ بعد ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے شبانہ سے رخصت ہوا۔ کوٹھی کے احاطے کے باہر اتفاق سے خالی ٹیکسی مل گئی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "شاہراہ الکرم پر معروف مٹھائی والے کی دکان تک لے چلو، خوب تیزی سے چلنا۔"

ٹیکسی اسٹارٹ ہوتے ہی تیز رفتاری دکھانے لگی۔ عاصم پچھلی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ پُر اسرار عاصم اس سے تقریباً پندرہ منٹ پہلے مٹھائی کی دکان کی طرف گیا تھا۔ اصلی کو توقع تھی کہ وہ نقلی کو وہاں پکڑ لے گا۔ ٹیکسی کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں تھی البتہ نقلی عاصم کی کار کے سامنے سے آئل ٹینکر گزر رہے تھے، اس لیے اسے مٹھائی والے تک پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جب اصلی عاصم ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کر رہا تھا، تب نقلی اپنی کار میں وہاں پہنچا۔

اصلی نے دور سے اسے دیکھا اور بڑی حیرانی سے دیکھا۔ وہ نقلی بالکل اس کے انداز میں چلتا ہوا مٹھائی کی دکان تک گیا تھا۔ اب وہ غصہ سے سوچ رہا تھا، کون بہروپیا عاصم بن کر میری شبانہ سے کھیل رہا ہے؟

وہ کار کے پاس آیا، اس کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے مٹھائی خریدنے والا عاصم نظر آرہا تھا۔ دکان کے سامنے وہی ایک گاہک تھا اس لیے جلد ہی مٹھائی خرید کر واپس آگیا۔ عاصم اسٹیئرنگ سیٹ پر جما ہوا تھا۔ اس کی فلیٹ ہیٹ پیشانی پر جھکی ہوئی تھی اور چہرے کو تقریباً چھپا رہی تھی۔ بہروپیا اگلی سیٹ کے دروازے کے قریب پہنچتے ہی ٹھٹک گیا پھر ذرا حیرانی ذرا تلخی سے بولا۔ "اے مسٹر! کون ہو تم؟ کیا نشہ میں ہو؟ کیا اسے اپنی کار سمجھ رہے ہو؟"

عاصم نے کہا۔ "یہ کار میری نہیں تو تمہاری بھی نہیں ہے اور کار تو بہت معمولی سی چیز ہے تمہاری گردن پر یہ جو تمہارا چہرہ ہے یہ بھی تمہارا نہیں ہے۔"

وہ چونک کر بولا۔ "کک۔ کیا تم وہی بلیک میلر ہو؟ دیکھو اب میں شبانہ کے گھر سے

کچھ چرا کر نہیں دے سکتا۔ وہ مجھ پر شبہ کرنے لگی ہے مجھ سے بیزار نظر آتی ہے۔ وہ روٹھ جاتی ہے تو میرا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ میں اس کا دیوانہ ہوں۔ اسے حاصل کرنے کے لیے میں نے جاناں جیسی حسین بیوی کو چھوڑ دیا، تم چاہو تو مجھے عاصم کے قتل کے الزام میں پھانسی کے تختے پر پہنچا دو، مجھے منظور ہے مگر اب میں شبانہ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

عاصم نے بڑے اطمینان سے فلیٹ ہیٹ کو اپنی پیشانی پر سے اٹھا دیا۔ اپنا چہرہ اس کی طرف گھما دیا۔ بہروپئے کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ ذرا ہٹ کر دیدے پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے اپنے سامنے جبران بیٹھا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟ بولو میں جبران ہوں یا تم؟ میں عاصم ہوں یا تم عاصم ہو؟"

بہروپیا کار کے باہر گم صم کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی عاصم کی طرح یہ سمجھ گیا تھا کہ سامنے جو اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ جبران کا چہرہ لیے ہوئے عاصم ہے۔

عاصم نے کہا۔ "ہم دونوں بلیک میلر کے ہاتھوں تماشہ بن چکے ہیں، اب راستہ چلنے والوں کو تماشہ نہ دکھاؤ۔ گاڑی میں آکر بیٹھ جاؤ۔"

وہ کار کی اگلی طرف سے گھوم کر عاصم کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "میں سمجھ گیا تم عاصم ہو۔ میں تمہاری نقل ہوں اور میں جبران ہوں تم میری نقل ہو۔ ویسے تم اس شہر میں کب آئے؟"

"کل.......... آیا تھا اور ابھی واپس جا رہا تھا۔ تمہیں یہاں کار سے اترتے دیکھ کر میں بھی ٹیکسی سے اتر گیا۔"

"کیا شبانہ سے ملاقات ہوئی؟"

عاصم نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شبانہ اب تک قانونی طور پر میری بیوی ہے لیکن میں جبران بننے کے بعد اپنا یہ قانونی حق استعمال نہیں کرسکتا۔ میں نے کل شبانہ سے اسٹوڈیو میں ملاقات کی تھی میرا خیال یہ تھا کہ میری بیوی شاید مجھ میں غیر محسوس قدرتی کشش محسوس کرے گی لیکن میں تمہارے روپ میں بدصورت بن گیا ہوں اور شبانہ اس بدصورتی سے نفرت کرتی ہے اس نے مجھے لفٹ نہیں دی۔"

جبران نے خوش ہو کر پوچھا۔ "تمہارا دل ٹوٹ گیا ہوگا؟"

عاصم نے کہا۔ "نہیں، مجھے خوشی ہوئی۔ شبانہ ایک وفادار بیوی ہے، وہ تم سے نہیں

میرے اس چہرے سے محبت کرتی ہے جو تمہارے چہرے پر سجا ہوا ہے۔''

عاصم نے ایسا کہتے ہی دل میں شبانہ کو گالی دی۔''وہ حرافہ وفادار کہاں ہے میں اس کے سامنے جبران بن کر گیا، اس نے ان جانے میں عاصم کو دھوکہ دے کر مجھے قبول کرلیا۔ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے مجھے یار بنالیا۔ کمبخت عورتوں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔''

جبران نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔''ہم نے اپنی اپنی محبوبہ تک پہنچنے کے لیے اپنے چہرے بدل لیے مگر بہت بڑی قیمت ادا کی۔ ہم نے غیرت کا سودا کیا۔ ایک دوسرے کو اپنی اپنی بیوی تک پہنچنے دیا۔ کبھی ہم اتنے غیرت مند تھے کہ اپنی اپنی بیوی کی خاطر ایک دوسرے کو ہلاک کردینا چاہا تھا۔ دیکھا جائے تو میں نے عاصم بننے کے لئے اپنے اندر کے غیرت مند جبران کو مار ڈالا۔ تم نے جبران بننے کے لیے اپنے اندر کے غیرت مند عاصم کو مار ڈالا۔''

''ہماری دنیا میں بے شمار لوگ اپنے اندر کے پیدائشی سچے انسان کو مار دیتے ہیں، اوپر سے ایک دوسرا آدمی بن کر جیتے ہیں۔ ہم نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنے چہرے چھپا لیے اور لوگ تو جھوٹی غیرت کی پلاسٹک سرجری کراتے ہیں اور اتنی رازداری سے اپنے اندر انسانیت کو مار دیتے ہیں کہ دوسروں کو پتہ نہیں چلتا۔''

جبران نے عاصم سے پوچھا۔''تم جبران بننے کے بعد اتنے عرصہ تک شبانہ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟ آخر یہ تجسس تو ہونا چاہیے کہ وہ تمہارے بعد بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے یا بیوی کی؟''

''یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔ کشور جاناں تمہاری بیوی تھی، کیا تم اس عرصے میں کبھی اسے دور سے بھی دیکھنے گئے؟''

جبران نے مسکرا کر کہا۔''ہم دونوں کے سوالات کے اندر جواب پوشیدہ ہیں۔ ہم دونوں کو اپنی بیویوں سے اتنی بھی دلچسپی نہیں ہوئی کہ انہیں دور ہی سے دیکھ لیں۔ محبوبہ کی کشش چپکائے رکھتی ہے میں اتنے عرصے بعد پہلی بار جاناں سے ملنے گیا تھا۔''

عاصم نے چونک کر پوچھا۔''کب ملنے گئے تھے؟ کیا اس نے ملاقات کی؟''

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔''دو دن پہلے ملنے گیا تھا مگر جاناں کو عاصم کا یہ چہرہ پسند نہیں ہے، وہ جبران کو پسند کرتی ہے اور جبران کا چہرہ تمہارے پاس ہے۔''

''جاناں نے تمہیں لفٹ نہیں دی، تمہارا دل ٹوٹ گیا ہوگا؟''

''بالکل نہیں......... مجھے بھی اس بات کی خوشی ہے کہ میری بیوی اس چہرے کی وفادار ہے جو تمہارے پاس ہے گویا وہ اب بھی میری وفادار ہے۔''

جبران نے ایسا کہتے ہی دل میں جاناں کو گالی دی۔ وہ خوبصورت بلا بیوی کی حیثیت سے وفادار نہیں ہے۔ میں اس کے سامنے عاصم بن کر گیا۔ اس نے اپنی دانست میں جبران کو دھوکا دے کر مجھے قبول کرلیا۔ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے مجھے اپنالیا۔ کمبخت بیویوں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔

عاصم نے کہا۔''اسٹوڈیو میں شبانہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھے جبران سمجھتی رہی لیکن اس نے یہ نہیں پوچھا کہ عاصم نے میرے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا تھا پھر میں زندہ کیسے ہوں؟''

جبران نے کہا۔''بلیک میلر نے مجھ سے کہا تھا کہ تم میری گولی سے ہلاک ہو گئے ہو۔ میں قاتل بن چکا ہوں۔ اس نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مجھے چھپنے کا مشورہ دیا۔ جب میں تمہارے روپ میں شبانہ کے پاس پہنچ گیا تب اس بلیک میلر نے بتایا کہ تم یعنی نقلی جبران زندہ ہو فوری طبی امداد کے ذریعے تمہیں بچا لیا گیا ہے۔ بلیک میلر نے اپنے مفاد کے لیے ہمیں خوب اُلو بنایا ہے۔''

''ہمیں بلیک میلر نے نہیں، بلکہ عشقیہ ہوس نے اُلو بنایا ہے۔''

ریلوے اسٹیشن کے سامنے کار رک گئی۔ عاصم نے کہا۔''میں ابھی ٹرین سے شہداد پور واپس جا رہا ہوں، آخری بات کہہ دوں کہ تمہاری موجودہ بیوی شبانہ نے مجھے لفٹ نہیں دی۔ میری موجودہ بیوی کشور جاناں نے تمہیں لفٹ نہیں دی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ہماری موجودہ بیویوں کے دماغوں سے صرف ان کے شوہر جھانکتے ہیں۔''

عاصم نے کار کے اوپری کیریر سے سوٹ کیس اٹھا کر کہا۔''گڈبائی تم جب بھی جاناں کے پاس آؤ گے ٹھکرائے جاؤ گے۔''

جبران نے اپنی کار کا اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔''اور تم جب بھی شبانہ کے پاس آؤ گے، دھتکارے جاؤ گے۔''

عاصم نے وہاں سے پلٹ کر اسٹیشن تک عمارت میں داخل ہوتے ہوئے دل میں

کہا۔ ''یہ الو خوش فہمی میں مبتلا ہے اسے کبھی پتہ نہیں چلے گا کہ اس کی موجودہ بیوی آئندہ بھی چوری چھپے مجھ سے ملتی رہے گی۔''

وہ اسٹیشن کی عمارت میں گم ہوگیا۔ جبران نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر اپنے آپ سے کہا۔ ''شبانہ ہمیشہ جبران کے چہرے سے نفرت کرتی ہے اب عاصم پر کبھی نہیں تھوکے گی مجھے ہی عاصم سمجھ کر پیار کرتی رہے گی۔ میں فائدے میں رہا۔ ادھر شبانہ جیسی وفادار بیوی ملی ادھر جاناں جیسی حسین محبوبہ مل گئی۔''

ادھر یہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اپنی وفادار بیوی کی طرف، ادھر وہ ٹرین میں بیٹھ کر اپنی وفادار بیوی کی طرف چلا گیا۔ سوال یہ ہے کیا بیویوں نے انہیں فریب دیا؟ نہیں، انہوں موجودہ شوہروں میں جو کمی یا تشنگی محسوس کی، اس کمی کو غیر شعوری طور پر اپنے جائز شوہروں سے پورا کیا۔ یہ پلاسٹک سرجری کی بات نہیں ہے۔ چہرے نہ بدلیں تب بھی اکثر لوگ اپنی فطرت بدلتے ہیں انہیں دوسروں کی بیویاں خوبصورت نظر آتی ہیں، یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری بیوی بھی دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہوگی۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم اپنے ہی عاشقانہ مزاج کے باعث اپنی اپنی بیویوں کو اپنے دماغ میں ڈی ڈی ٹی چھڑکنے کا موقعہ دیتے ہیں۔

☆======ختم شد======☆